ترتیب

حصّۂ نثر

حصّۂ نظم

گیت 162-165

قطعہ 166-174

مثنوی 175-180

انشائیہ

انگریزی میں انشائیہ اور مضمون دونوں کے لیے Essay کی اصطلاح رائج ہے۔ انشائیہ ادیب کی ذہنی رَو اور ادبی اسلوب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار زندگی کی عام یا خاص بات یا کیفیت کو اپنی افتادِ طبع، علمیت اور شگفتہ نگاری سے پُرلطف انداز میں بیان کر دیتا ہے۔ ابتدا میں تمثیلی انشائیے بھی لکھے گئے۔ انھیں رمزیے (Allegory) کہا جاتا ہے۔ ان کی بہترین مثال محمد حسین آزاد کی کتاب 'نیرنگِ خیال' ہے۔ سرسید، شبلی، حالی اور خواجہ حسن نظامی سے لے کر نیاز فتح پوری، سیّد عابد حسین، خواجہ غلام السیّدین، محمد مجیب، رشید احمد صدیقی اور ان کے بعد کے لکھنے والوں کی بعض تحریریں انشائیہ بھی کہی جا سکتی ہیں اور مضمون بھی۔ کنہیا لال کپور، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم، وزیر آغا اور مجتبیٰ حسین وغیرہ ہمارے زمانے کے ممتاز انشائیہ نگار ہیں۔

سر سیّد احمد خاں

(1817ء – 1898ء)

سیّد احمد خاں دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ سیّد احمد نے اپنے زمانے کے اہلِ کمال سے فیض حاصل کیا۔ 1839ء میں انھوں نے انگریزی سرکار کی ملازمت اختیار کی اور مختلف مقامات پر کام کیا۔ 1862ء میں جب وہ غازی پور میں تھے، انھوں نے ایک انجمن 'سائنٹفک سوسائٹی' کے نام سے بنائی۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ مختلف علوم، خاص کر سائنس کے علوم کا مطالعہ کیا جائے اور ان علوم کو ہندوستانیوں میں عام کیا جائے۔ 1869ء میں سیّد احمد خاں ایک سال کے لیے انگلستان گئے۔ واپس آکر انھوں نے انگریزی کے علمی اور سماجی رسالوں کی طرز پر اپنا ایک رسالہ 'تہذیب الاخلاق' نکالنا شروع کیا۔

انگلستان سے واپس آکر سیّد احمد خاں نے علی گڑھ میں 1875ء میں ایک اسکول کھولا۔ یہ اسکول 1878ء میں 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' اور پھر 1920ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ہندوستان کا ایک نمایاں تعلیمی ادارہ بن گیا۔

1878ء میں سیّد احمد خاں کو 'سر' کا خطاب ملا۔ اس لیے لوگ انھیں 'سر سیّد' کے نام سے جانتے ہیں۔ سر سیّد آخر عمر تک قومی کام، کالج کی دیکھ بھال اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ ان کی متعدد تصانیف میں 'آثار الصّنادید'، 'اسباب بغاوتِ ہند' اور 'سرکشیِ ضلع بجنور' خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے مضامین کئی جلدوں میں مجلسِ ترقّیِ ادب لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سائنس، فلسفہ، مذہب اور تاریخ سے متعلق مضامین ہیں۔

جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالنے کے ساتھ ساتھ سر سیّد نے اردو میں مختصر مضمون نگاری کو بھی فروغ دیا۔ لمبی لمبی تحریروں کے بجائے چند صفحات میں کام کی بات کہنے کا فن سر سیّد نے عام کیا۔ سر سیّد اپنے زمانے کے مفکّر اور مُصلح تھے اور ان کی نثر میں، وہی وزن اور وقار ہے جو ان کی شخصیت میں تھا۔

گُزرا ہوا زمانہ

برس کی اخیر رات کو ایک بڈّھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے، رات بھی ڈراونی اور اندھیری ہے، گھٹا چھا رہی ہے، بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے، آندھی بڑے زور سے چلتی ہے، دل کانپتا ہے اور دَم گھبراتا ہے۔ بڈّھا نہایت غمگین ہے، مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے، نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کا غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منھ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے، اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے، جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیے، اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ، بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لیے چھُٹّی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لیے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چِلّا اُٹھتا تھا ''ہائے وقت، ہائے وقت! گزرے ہوئے زمانے! افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔''

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، امنگ میں بھرا ہوا دل، جذباتِ انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے، نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا ''اُہ ابھی بہت وقت ہے'' اور بڑھاپے کے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھّا ہوتا اگر جب ہی میں

اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لیے تیار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا، آہ وقت گزر گیا۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ''ابھی وقت بہت ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی، دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراونی ہے، اندھیری گھٹا چھا رہی ہے، بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے، ہولناک آندھی چل رہی ہے، درختوں کے پتّے اُڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں، تب وہ چلّا کر بولا ''ہائے ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراونی ہے جیسی یہ رات'' یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا یاد آئے جن کی ہڈّیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں سے یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمھارے ہی بھلے کے لیے نہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دیے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروّتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ، بھائی، بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض کرنا، بھائی بہن سے بے مروّت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا اور اس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلّا اٹھتا تھا کہ ہائے وقت نکل گیا، ہائے وقت نکل گیا، اب کیوں کر اس کا بدلہ ہو!

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑکھڑاتا کھڑکی تک پہنچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا اَدھیڑ پن یاد آیا جس میں کہ نہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن، نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش، اس نے اپنی اس نیکی کے زمانے کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوٰۃ دینی، بھوکوں کو کھلانا، مسجدیں اور کنویں بنوانا یاد کرکر اپنے دل کو تسلّی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کی جن سے بیعت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا، مگر دل کی بے قراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں، مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں اور یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنویں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر، کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی، اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلّا اٹھا ''ہائے وقت، ہائے وقت! میں نے تجھ کو کیوں کھودیا؟''

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے، آندھی تھم گئی ہے، گھٹا کھُل گئی ہے، تارے نکل آئے ہیں، ان کی چمک سے اندھیرا ابھی کچھ کم ہوگیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکا یک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آ گئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہوگیا اور نہایت پاک دل اور محبّت کے لہجے سے پوچھا کہ تم کون ہو، وہ بولی کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اس نے پوچھا کہ تمھاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے۔ وہ بولی ہاں ہے، نہایت آسان پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کے فرض اس بدوی کی طرح جس نے کہا کہ ''واللّٰہ لا ازید ولاانقص'' ادا کرکر انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے، انسان ہی

ایسی چیز ہے جو اخیر تک رہے گا۔ پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادّی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں، مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں، جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں تو دل و جان و مال سے ساعی ہو۔ یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کیے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کیے تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دل فریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہو کر چلّا اٹھا ''ہائے وقت، ہائے وقت، کیا پھر تجھے میں بُلا سکتا ہوں؟ ہائے میں دس ہزار دینار یں دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک آہِ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آ کھڑی ہوئی، اس کو گلے لگا کر اس کی بیّ لی۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے؟ کیوں تو بے قرار ہے؟ کس لیے تیری ہچکی بندھ گئی ہے؟ اُٹھ منھ ہاتھ دھو، کپڑے پہن، نوروز کی خوشی منا، تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈّھا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سن کر اس کو جواب دیا کہ بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا کہ اس پشیمان بڈھے نے کیا، بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ او یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے، میں کبھی اس بڈّھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ او خدا، او خدا تو میری مدد کر، آمین۔

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو! اور اے میری قوم کے بچّو، اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو، تا کہ اخیر وقت میں اس بڈّھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے، آمین۔

سرسیّد احمد خاں

مشق

لفظ و معنی

مکتب	:	مدرسہ
کج خُلقی	:	مزاج کا کڑواپن، روکھاپن
بیعت کرنا	:	مُرید بننا، اطاعت کا عہد لینا
تسخیر	:	قابو میں کرنا، فتح کرنا
بدوی	:	عرب کے وہ باشندے جو گھر نہیں بناتے، ریگستانوں میں رہتے ہیں اور زیادہ تر زندگی اونٹوں پر یا خیمے میں گزارتے ہیں۔
واللہ لا ازید ولا انقص	:	(عربی فقرہ) خدا کی قسم نہ میں زیادہ کروں گا اور نہ کم
سعی	:	کوشش

ساعی	:	کوشش کرنے والا
مبنی	:	منحصر
پشیمان	:	شرمندہ، پچھتانے والا

غور کرنے کی بات

- سرسیّد اپنے زمانے کے مفکّر اور مُصلح تھے۔ ان کی نثر میں وہی سنجیدگی، وزن اور وقار ہے جو ان کے کردار میں تھا۔
- اس مضمون میں سرسیّد کا اسلوب بڑا افسانوی ہے۔ آخری اقتباس سے قبل یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ سرسیّد کی کہانی کا ہیرو کوئی بوڑھا نہیں بلکہ ایک کم عمر لڑکا ہے۔
- سرسیّد وقت کی اہمیت کو اچھّی طرح سمجھتے تھے اور اپنی تحریروں کے ذریعے وہ قوم کے نوجوانوں کو وقت کی قدر و قیمت کا احساس دلاتے رہتے تھے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. بوڑھا اپنی جوانی کے زمانے کو کن لفظوں میں یاد کرتا ہے؟
2. سرسیّد نے برس کی اخیر رات کا ذکر کس طرح کیا ہے؟
3. بوڑھے کو جو خوب صورت دلہن نظر آئی، اس سے مصنّف کی کیا مراد ہے؟
4. ماں نے لڑکے کو کیا نصیحت کی؟
5. لڑکے نے کیا عہد کیا؟
6. آخری پیراگراف میں سرسیّد نے قوم کے نوجوانوں کو کیا نصیحت کی ہے؟

عملی کام

- سبق کی بلند خوانی کیجیے۔
- مضمون میں 'نیکی بدی'، 'آسان مشکل' جیسے متضاد الفاظ ایک ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔
  آپ اسی طرح کے کچھ متضاد الفاظ سوچ کر لکھیے۔
- مندرجہ ذیل محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے:
  دل پاش پاش ہونا، ہچکی بندھنا، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا
- مندرجہ ذیل لفظوں میں سے مذکر اور مونث الگ الگ کیجیے:
  اندھیرا، زندگی، آشنا، جوبن، کھڑکی، گھٹا، بجلی، بادل

غزل

'غزل' عربی کا لفظ ہے۔ اس کے اصل معنی ہیں محبوب سے باتیں کرنا، عورتوں سے باتیں کرنا۔ وہ شاعری جسے غزل کہتے ہیں اس میں بنیادی طور پر عشقیہ باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ غزل میں دوسرے مضامین بھی داخل ہوتے گئے ہیں اور آج یہ کہا جاسکتا ہے کہ غزل میں تقریباً ہر طرح کی باتیں کی جاسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزل اُردو کی سب سے مقبول صنفِ سخن ہے۔ غزل کا ہر شعر عام طور پر اپنے مفہوم کے اعتبار سے مکمل ہوتا ہے۔

جس طرح غزل میں مضامین کی قید نہیں ہے اسی طرح اشعار کی تعداد بھی مقرّر نہیں۔ یوں تو غزل میں عموماً پانچ یا سات شعر ہوتے ہیں، لیکن بعض غزلوں میں زیادہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک ہی بحر، قافیے اور ردیف میں شاعر ایک سے زیادہ غزلیں کہہ دیتا ہے۔ اس کو 'دوغزلہ'، 'سہ غزلہ'، 'چہار غزلہ' کہا جاتا ہے۔

کسی غزل کے اگر تمام شعر موضوع کے لحاظ سے آپس میں یکساں ہوں تو اسے غزلِ مسلسل کہتے ہیں اور اگر شاعر غزل کے اندر کسی ایک مضمون یا تجربے کو ایک سے زیادہ اشعار میں بیان کرے تو اسے قطعہ اور ایسے اشعار کو قطعہ بند کہتے ہیں۔

غزل کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں 'مطلع' کہلاتا ہے۔ مطلع کے بعد والا شعر 'زیبِ مطلع' یا 'حسنِ مطلع' کہلاتا ہے۔ غزل میں ایک سے زیادہ مطلعے بھی ہوسکتے ہیں۔ انھیں مطلع ثانی (دوسرا) مطلع ثالث (تیسرا) کہا جاتا ہے۔ غزل کا وہ آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلّص استعمال کرتا ہے 'مقطع' کہلاتا ہے۔ غزل کا سب سے اچھّا شعر 'بیت الغزل' یا 'شاہ بیت' کہلاتا ہے۔ جس غزل میں ردیف نہ ہو اور صرف قافیے ہوں، اس کو 'غیر مردّف غزل' کہتے ہیں۔

ولی محمد ولؔی

(1667ء – 1707ء)

ولؔی کے نام، تاریخِ پیدائش اور جائے پیدائش، سب کے بارے میں اختلاف ہے۔ لیکن بیشتر لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ ان کا نام ولی محمد اور تخلص ولؔی تھا۔ وہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ بعد میں احمد آباد آکر انھوں نے شاہ وجیہہ الدین کی خانقاہ کے مدرسے میں تعلیم مکمل کی اور یہیں شاہ نورالدین سہروردی کے مرید ہوئے۔ ولؔی نے فارسی الفاظ اور اندازِ بیان کی آمیزش سے ایک نیا رنگ پیدا کیا۔ ولؔی کے کلام کا یہ نیا رنگ نہ صرف ان کی مقبولیت کا باعث بنا بلکہ اس زمانے کے دہلی کے شعرا نے بھی اس کا اثر قبول کیا اور وہ بھی اسی انداز میں شاعری کرنے لگے۔ ولؔی کے اثر سے دہلی میں اردو شاعری کا چلن عام ہوا جو آگے چل کر روز بہ روز ترقی کرتا گیا۔ ولؔی کا انتقال احمد آباد میں ہوا۔

ولؔی اپنے زمانے کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں صلاحیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ ولؔی سے پہلے قصیدہ اور مثنوی کا رواج زیادہ تھا۔ ولؔی نے غزل کو اوّلیت دے کر اردو شاعری کو ایک نیا موڑ دیا۔ ان کی غزلوں میں خیال کی ندرت اور بیان کی لطافت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں حسن و عشق کے مضامین کے ساتھ ساتھ تصوف و معرفت کو بھی جگہ دی۔ عشقیہ واردات و کیفیات کے بیان میں سرور و مستی کا انداز پایا جاتا ہے۔ ولؔی محبوب کے حسن کے داخلی اثرات کے ساتھ ساتھ اس کے خارجی اوصاف کا بیان بڑے پُرلطف اور دل کش انداز میں کرتے ہیں۔ ولؔی کی زبان میں ایک خاص مٹھاس ہے، جو ہندی، دیسی اور فارسی کے الفاظ کو توازن کے ساتھ استعمال کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔

غزل

مفلسی سب بہار کھوتی ہے　　مرد کا اعتبار کھوتی ہے

کیوں کہ حاصل ہو مُج کوں جمعیّت　　زلف تیری قرار کھوتی ہے

ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب　　مُج انکھاں کا خمار کھوتی ہے

کیوں کے ملنا صنم کا ترک کروں　　دلبری اختیار کھوتی ہے

اے ولؔی آب اس پری رُو کی

مج سِنے کا غبار کھوتی ہے

ولی محمد ولؔی

مشق

لفظ و معنی

مفلسی	:	غریبی
کھونا	:	لے جانا، ختم کر دینا، گم کرنا
جمعیّت	:	سکون، ٹھہراؤ
انکھاں	:	آنکھیں

خمار	:	پیاس یعنی شراب کی طلب، لیکن اسے بہت سے لوگ 'نشہ' کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہاں دونوں معنی صحیح ہو سکتے ہیں۔
صنم	:	محبوب (اصل معنی بت)
کیوں کے	:	کیوں کر
آب	:	چمک، پانی۔ یہاں چمک کے معنی میں ہے۔
دلبری	:	محبوبیت
مُج	:	میرے، میرا
پری روٗ	:	پری چہرہ (خوبصورت چہرے والا)
سنے	:	سینہ
غبار	:	رنجیدگی، ناخوشی

غور کرنے کی بات

- غزل میں بہت سے الفاظ ایسے آئے ہیں جو اَب نہیں بولے جاتے۔ جیسے مج کوں (مجھ کو)، انکھاں (آنکھیں)، سنے (سینہ) کوں (کو) مج، مجھ بمعنی میرا، میرے
- اس غزل کے آخری شعر میں ایک لفظ 'آب' آیا ہے۔ یہاں اس کے معنی چمک کے ہیں لیکن آب پانی کو بھی کہتے ہیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. مرد کا اعتبار کھونے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
2. کون سی چیز شاعر کے سینے کا غبار کھو رہی ہے؟
3. شاعر صنم سے ملنا کیوں نہیں ترک کر پاتا ہے؟

عملی کام

- اس غزل کو بلند آواز سے پڑھیے اور زبانی یاد کیجیے۔
- نیچے دیے گئے الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے:
  مفلسی، بہار، اعتبار، سحر، اختیار، غبار
- کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو لکھنے میں ایک جیسے بھی نہیں ہوتے اور ان کو پڑھنے میں معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ جیسے نذر۔نظر، نذیر۔نظیر، اَسرار۔اِصرار، اَلم۔علم، عقل۔اَقل۔
  آپ اپنے استاد سے ان الفاظ کا فرق معلوم کر کے لکھیے۔
- غزل کے دوسرے شعر میں ایک لفظ 'حاصل' آیا ہے اگر ہم اس کے شروع میں ل+ا (لا) لگا دیں تو اس کے معنی ہی بدل جائیں گے اور یہ لفظ بن جائے گا 'لاحاصل' یعنی جس سے کچھ حاصل نہ ہو۔ آپ اسی طرح (لا) لگا کر پانچ الفاظ لکھیے۔

میرؔ تقی میرؔ

(1722ء – 1810ء)

میرؔ تقی میرؔ آگرے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد درویش صفت انسان تھے۔ میرؔ کی نوعمری میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا پھر میرؔ دہلی آ گئے اور یہاں طویل عرصے تک رہے۔ یہاں خان آرزوؔ کی صحبتوں نے ان کے ذوقِ شعر اور علم کو ترقی دی اور بہت جلد وہ دہلی کے نمایاں شعرا میں گنے جانے لگے۔ دلّی میں انھوں نے اچھّے اور برے دونوں طرح کے دن گزارے، اپنے مربّیوں کے ساتھ کچھ وقت راجپوتانے میں گزارا اور بالآخر 1782ء کے قریب وہ لکھنؤ آ گئے۔ نواب آصف الدولہ نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور لکھنؤ میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ اُن کے زمانے سے لے کر آج تک تمام شعرا اور ناقدین نے ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ انھیں 'خدائے سخن' کہا جاتا ہے اور عام طور پر لوگ انھیں اردو کا سب سے بڑا شاعر قرار دیتے ہیں۔

میرؔ کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی اپنی شاعری میں اتنی ہی خوبی سے جگہ دی ہے جس خوبی سے وہ رنج و غم کی بات کرتے ہیں۔ ان کی شاعری بظاہر سادہ ہے لیکن اس میں فکر کی گہرائی ہے۔ ان کے شعر دل کو چھوتے ہیں۔ میرؔ اپنی شاعری میں لفظوں کو نئے نئے رنگ سے استعمال کرتے ہیں اور اپنے کلام میں نئے نئے معنی پیدا کرتے ہیں۔ میرؔ نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا اصل میدان غزل اور مثنوی ہے۔ اُردو میں ان کا ضخیم کُلّیات شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے 'ذکرِ میرؔ' کے نام سے فارسی زبان میں آپ بیتی لکھی اور 'نکات الشعرا' کے نام سے اردو شاعروں کا تذکرہ لکھا جسے اردو شعرا کا پہلا تذکرہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

غزل

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لوہو آتا ہے، جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے، تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونسِ ہجراں — سو وہ مدّت سے اب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم — پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

دوٗر بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے
عشق بِن یہ ادب نہیں آتا

میر تقی میرؔ

مشق

لفظ و معنی

اشک : آنسو

وہ : یہاں بمعنی محبوب

لوہو : (لہو) خون

مونس : دوست، دل کو تسلّی دینے والا

ہجراں : جدائی

گریہ : آنسو

ہمدم : ساتھی

سخن : بات

غبارِ میرؔ : میرؔ کی خاک (یعنی مرکر خاک ہوجانے کے بعد میرؔ کا جسم غبار بن کر ہوا میں اُڑ رہا ہے)

غور کرنے کی بات

- میرؔ کی شاعری فکر، اسلوب اور فن کے لحاظ سے منفرد درجہ رکھتی ہے۔
- میرؔ اپنے اشعار میں سہل اور سادہ زبان استعمال کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسے الفاظ ان کی شاعری میں آجاتے ہیں جو اب متروک ہیں۔
- میرؔ کے کلام میں بیان کی سادگی کے باوجود سوز وگداز اور اثر آفرینی ہے۔
- یہ غزل چھوٹی بحر میں ہے اور میرؔ کی سادگی بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ سہلِ ممتنع ہے اور سہلِ ممتنع اس کلام کو کہتے ہیں جو بظاہر بہت آسان معلوم ہو لیکن جب اس کا جواب (یعنی اس کی طرح کا کلام) لکھنے بیٹھیں تو جواب ممکن نہ ہوسکے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. پہلے شعر میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟
2. شاعر نے گریہ آنے کا کیا سبب بتایا ہے؟
3. اس غزل کے مقطعے کا مطلب اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

عملی کام

- استاد کی مدد سے غزل کو صحیح تلفّظ اور مناسب ادائیگی سے پڑھیے۔
- اس غزل کو خوشخط لکھیے۔
- اس غزل میں کون کون سے قافیے استعمال ہوئے ہیں، لکھیے۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

(1797ء – 1869ء)

مرزا غالبؔ آگرے میں پیدا ہوئے۔ باپ اور چچا کی موت کی وجہ سے غالبؔ بچپن ہی میں تنہا رہ گئے اور ان کی دادی نے ان کی پرورش کی۔ تیرہ سال کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی۔ کچھ عرصہ بعد غالبؔ دلّی آگئے اور عمر بھر یہیں رہے۔ غالبؔ کی زندگی کے آخری دن لمبی بیماری کی وجہ سے تکلیف میں گزرے لیکن ان کے مزاج کی شوخی اور ذہن کی تازگی تا عمر برقرار رہی۔

غالبؔ اُردو کے چند سب سے بڑے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ ابتدا میں اسدؔ تخلص کرتے تھے، بعد میں غالبؔ اختیار کیا۔ انھوں نے اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ انھیں عام راستے سے الگ نئی راہ بنا کر چلنے کا شوق تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام اپنے عہد کے شاعروں بلکہ کم وبیش اردو کے تمام شاعروں کے کلام سے منفرد ہے۔ غالبؔ کے کلام کو عموماً مشکل سمجھا جاتا ہے پھر بھی ان کے اشعار کی ایک بڑی تعداد آج بھی لوگوں کی زبان پر ہے۔ ان کا بہت سا کلام سادہ اور بظاہر آسان بھی ہے۔ غالبؔ کے اُردو اشعار کا مجموعہ 'دیوانِ غالبؔ' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کے اُردو خطوط کے دو مجموعے 'عودِ ہندی' اور 'اُردوئے معلّٰی' معروف ہیں۔ ان کے خطوط میں اردو نثر کی ادبی شان، اپنے زمانے کے حالات، ادبی مباحث پر گفتگو غرض بہت کچھ ملتا ہے جس کے باعث غالبؔ ہمارے سب سے بڑے شاعروں کے ساتھ سب سے بڑے نثر نگاروں میں بھی شمار ہوتے ہیں۔

غزل

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھّا ہوا، بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا، گِلا نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مِرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

مرزا غالبؔ

مشق

لفظ و معنی

منت کش	:	احسان اُٹھانے والا
رقیب	:	حریف، عاشق کا مقابل اور مخالف
گِلا	:	شکایت
مزا	:	مزہ
خبر گرم	:	کسی خبر کا بہت مشہور ہونا
خنجر آزما	:	خنجر چلانے والا
نمرود	:	ملک عراق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کے ایک بادشاہ کا نام جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔
بندگی	:	فرماں برداری، اطاعت
غزل سرا ہونا	:	غزل گانا یعنی غزل کو محفل میں پیش کرنا

غور کرنے کی بات

- اس غزل میں سادگی بیان اور عام گفتگو کا انداز ہے اور کہیں کہیں خود کلامی کا انداز بھی ہے۔ خود کلامی سے مراد اپنے آپ سے بات کرنا ہے۔ مثلاً غزل کے مطلع اور شعر 5، 6 اور 7 میں خود کلامی کا انداز ہے۔
- غالبؔ غزل کے ممتاز شاعر ہیں، کم سے کم لفظوں میں بات کو کہنا، سادگی کے ساتھ ساتھ معنی کی گہرائی ان کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔

- 'حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا' اس مصرعے میں لفظ حق دو جگہ آیا ہے۔ اس لفظ کے دونوں جگہ الگ الگ معنی ہیں۔ ایک حق ہونا (سچ) اور دوسرا حق ادا ہونا (فرض)
- مطلع کو غور سے پڑھیے۔ دوسرے مصرعے میں لفظ 'اچھّا' یوں تو 'بُرا' کی ضد ہے لیکن یہاں یہ لفظ صحت یاب ہونے کے معنی میں آیا ہے۔ اس اعتبار سے 'اچھّا'، 'برا' اور 'ہوا'، 'نہ ہوا' الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ شعر کی یہ خوبی صنعتِ تضاد کہلاتی ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. 'میں نہ اچھّا ہوا، برا نہ ہوا' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
2. شاعر نے رقیبوں کو جمع کرنے پر کیوں اعتراض کیا ہے؟
3. پانچویں شعر میں 'نمرود' کی خدائی سے کیا مراد ہے؟
4. 'جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی' اس مصرعے میں 'اُسی' کا اشارہ کس کی طرف ہے؟

عملی کام

- غزل کے اشعار بلند آواز میں پڑھیے اور اپنے دوست سے پسندیدہ غزل کے دو اشعار سنیے۔
- غزل کو خوشخط لکھیے اور زبانی یاد کیجیے۔
- اس غزل میں کیا کیا قافیے استعمال ہوئے ہیں، لکھیے۔

(1881ء – 1951ء)

سیّد فضل الحسن حسرتؔ، قصبہ موہان، ضلع اناؤ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے عربی، فارسی گھر پر پڑھی اور انگریزی تعلیم اسکول میں حاصل کی۔ علی گڑھ سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے ایک ادبی ماہنامہ ''اردوئے معلّٰی'' جاری کیا جو عرصۂ دراز تک اردو زبان و ادب کی خدمت کرتا رہا۔ حسرتؔ مذہبی انسان تھے۔ ان کا ذہن ہر قسم کے تعصّبات سے پاک تھا۔ ان میں کمال کی اخلاقی جرأت تھی۔ جو بات دل میں ہوتی وہی زبان پر لاتے۔ منافقت اور تصنّع سے انھیں دور کا واسطہ نہ تھا۔ خودداری، بے باکی، اصول پسندی، سادگی اور خلوص ان کے نمایاں اوصاف تھے۔

حسرتؔ کو طالب علمی کے زمانے سے شعر و شاعری کا شوق تھا لیکن وہ تحریکِ آزادی میں بھی عملی طور پر شریک رہے۔ قوم کے بڑے رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے رسالے 'اردوئے معلّٰی' کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ انھوں نے کئی بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، لیکن آزادیِ کامل کے سلسلے میں کسی سمجھوتے کے قائل نہ تھے۔ 'مکمل آزادی' کا نعرہ سب سے پہلے انھوں نے ہی بلند کیا تھا۔

اُردو غزل کو ازسرِ نو مقبول بنانے میں حسرتؔ موہانی کا بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے غزل کو تہذیبِ عاشقی کی شائستہ زبان سے آشنا کیا اور درد و اثر کے ساتھ شیرینی، دل کشی اور طرزِ ادا میں شگفتگی و لطافت پیدا کی۔ حسرتؔ موہانی نے اپنی غزل میں عشقیہ مضامین کے علاوہ قومی سیاست اور قومی یک جہتی پر مبنی مضامین بھی داخل کیے۔ انھوں نے پرانے شعرا کا ایک بہت عمدہ

انتخاب 'انتخابِ سخن' کے نام سے چودہ جلدوں میں شائع کیا اور اس انتخاب کے ذریعے کئی ایسے شعرا کا کلام محفوظ ہو گیا اور دور دور تک پہنچا جو پردۂ گم نامی میں تھے۔

حسرتؔ موہانی نے نواب اصغر علی خان نسیمؔ کے شاگرد منشی امیر اللہ تسلیمؔ کی شاگردی اختیار کی۔

غزل

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام　　دہکا ہوا ہے آتشِ گُل سے چمن تمام

حیرت غرورِ حسن سے، شوخی سے اضطراب　　دل نے بھی، تیرے سیکھ لیے ہیں چلن تمام

دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں　　بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

نشو و نمائے سبزہ وگُل سے بہار میں　　شادابیوں نے گھیر لیا ہے چمن تمام

اچھّا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں　　پھیلے گی یونہی شورشِ حُبّ ِ وطن تمام

سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریبِ مرگ　　مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ وزغن تمام

شیرینیِ نسیمؔ ہے سوز و گدازِ میرؔ
حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

حسرتؔ موہانی

مشق

لفظ و معنی

انجمن : محفل

چلن : طریقہ، ڈھنگ

اضطراب : بے چینی

نشو ونما	:	پھلنا پھولنا، فروغ پانا
اہلِ جور	:	ظلم کرنے والے
شورش	:	ہنگامہ، شور
زاغ	:	کوّا
زغن	:	چیل

غور کرنے کی بات

- حسرتؔ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی ہے۔ ان کی زندگی جتنی سخت کوشی میں گزری ان کی شاعری اسی قدر نشاط انگیز ہے۔
- مقطعے میں نسیمؔ سے مراد نواب اصغر علی خاں نسیمؔ دہلوی ہیں جو کہ حسرتؔ موہانی کے استاد منشی امیر اللہ تسلیمؔ کے استاد تھے۔ وہ جس طرح نسیمؔ کی شیرینی کے قائل تھے اسی طرح میرؔ کے سوز و گداز کے بھی معترف تھے۔ شیرینی سے مراد زبان کی صفائی اور اس کا بامحاورہ اور سلیس ہونا ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. 'دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام' اس مصرعے میں آتشِ گل سے کیا مراد ہے؟
2. اہلِ جور سے شاعر کا کیا مطلب ہے؟
3. غزل کے کس شعر میں تعلّی کا اظہار کیا گیا ہے؟
4. شاعر کے خیال میں وطن سے محبّت کا شور کن وجوہ سے پھیل رہا ہے؟

عملی کام

- غزل کی بلند خوانی کیجیے۔
- پسندیدہ اشعار یاد کیجیے۔
- غزل کے اشعار کو خوش خط لکھیے۔
- اس غزل کے قافیوں کی نشاندہی کیجیے اور ان سے ملتے جلتے تین اور قافیے لکھیے۔
- اشعار میں مختلف جگہوں پر اضافت کا استعمال ہوا ہے، ایسے الفاظ تلاش کر کے لکھیے۔
- جن اشعار میں حرفِ عطف کا استعمال ہوا ہے اُن شعروں کی نشاندہی کیجیے۔
- مقطعے میں جن تین شعرا کے تخلّص آئے ہیں ان کے پورے نام لکھیے۔

فراؔق گورکھپوری

(1896ء – 1982ء)

ان کا نام رگھو پتی سہائے، اور فراؔق تخلص تھا۔ شاعری انھیں ورثے میں ملی تھی اور ان کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرؔت گورکھپوری اپنے وقت کے مشہور شاعر تھے۔ فراؔق بھی بچپن ہی سے شعر کہنے لگے اور انھوں نے نظم، غزل، رُباعی وغیرہ شعری اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کا شمار اردو کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ 1917ء میں کانگریس میں شامل ہوئے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد تھے۔

فراؔق کا کلام انسانی عظمت اور دردمندی کے احساس سے بھرا ہوا ہے۔ انھوں نے عشقیہ معاملات کے ساتھ ساتھ زندگی کے دیگر مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کی زبان میں گھلاوٹ اور مٹھاس ہے۔ انھوں نے عشق کے معاملات کو اکثر بالکل نئے ڈھنگ سے پیش کیا ہے اور بعض نئے مضامین بھی استعمال کیے ہیں۔ رباعی میں انھوں نے سنسکرت کے سنگھار رس سے استفادہ کرتے ہوئے معشوق کو ایک نئے اور دلکش گھریلو رنگ میں پیش کیا۔

'نغمۂ ساز'، 'غزلستان'، 'شعرستان'، 'شبنمستان'، 'روحِ کائنات'، 'گُلِ نغمہ'، 'روپ' اور 'گلبانگ' کے نام سے کئی شعری مجموعے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ انھوں نے اعلا درجے کی تنقید بھی لکھی۔ ان کی نثری کتابوں میں 'اندازے' اور 'اردو کی عشقیہ شاعری' معروف ہیں۔ فراؔق گورکھپوری کو گیان پیٹھ ایوارڈ اور دوسرے کئی اہم اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

غزل

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنّا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبّت کا بھروسا بھی نہیں

ایک مدّت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں

یوں تو ہنگامے اٹھاتے نہیں دیوانۂ عشق
مگر اے دوست، کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں، نہ بیگانوں میں
لیکن اُس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
آج ہی خاطرِ بیمار شکیبا بھی نہیں

ہم اُسے منھ سے بُرا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ
دوست تیرا ہے، مگر آدمی اچھّا بھی نہیں

فراقؔ گورکھپوری

مشق

لفظ و معنی

سودا : جنون، دیوانگی

تمنّا : آرزو، خواہش

ترک کرنا : چھوڑنا

یگانہ : اس لفظ کے اصل معنی ہیں 'جس کی کوئی نظیر نہ ہو، واحد' لیکن شاعر نے یہاں اسے 'بیگانہ' کی ضد کے طور پر استعمال کیا ہے

بیگانہ : غیر

جلوہ گہہ : جلوہ، صورت، یا صورت کی جھلک نظر آنے کی جگہ

ناز : ادا

شکیبا : جسے صبر حاصل ہو، جسے صبر آ جائے

خاطر : دل

رنجش : ناراضگی

بے جا : نامناسب، بلاوجہ، بے سبب

غور کرنے کی بات

- فراقؔ کی غزل گوئی منفرد آہنگ و انداز رکھتی ہے۔
- فراقؔ کی غزل میں روایت کا پاس بھی ہے اور جدّت کا اظہار بھی ہے۔
- فراقؔ کے اسلوب میں صفائی اور بے ساختگی ہے جس کی ایک مثال یہ غزل ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. مطلع میں شاعر نے کس کیفیت کا اظہار کیا ہے؟
2. 'خاطرِ بیمار' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
3. غزل کے تیسرے شعر میں محبّت کرنے والے کی کس نفسیاتی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے؟
4. جلوہ گہہِ ناز سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

عملی کام

- استاد کی مدد سے شعروں کی صحیح قرأت کیجیے۔
- غزل کے اشعار خوش خط لکھیے۔
- ذیل میں دیے گئے اشعار کو مکمل کیجیے:

.... آج ہی خاطرِ بیمار شکیبا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں، نہ بیگانوں میں ....

(1920ء – 2000ء)

اسرار حسن خاں مجروحؔ سلطان پوری، سلطان پور، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر انھوں نے لکھنؤ سے طب کی سند حاصل کی اور طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ لیکن بچپن سے ہی انھیں شاعری سے لگاؤ تھا اور بہت جلد وہ طبابت چھوڑ کر صرف شاعری کرنے لگے۔ بعد میں وہ ممبئی چلے گئے اور انھوں نے فلم کے لیے بہت سے مقبول اور مشہور گیت لکھے۔ ان کا شعر پڑھنے کا انداز ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ ان کا شمار ترقّی پسند غزل کے نمائندہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام کے مجموعے 'غزل' اور 'مشعلِ جاں' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

مجروح کو 'اقبال اعزاز' (جسے عام طور پر اقبال سمّان کہتے ہیں) اور 'دادا صاحب پھالکے ایوارڈ' کے علاوہ بھی دیگر کئی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔

غزل

ہم ہیں متاعِ کوچہ وبازار کی طرح
اُٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

وہ تو کہیں ہے اور، مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہِ یار کی طرح

سیدھی ہے راہِ شوق پہ یوں ہی کہیں کہیں
خم ہوگئی ہے گیسوئے دل دار کی طرح

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

اب جا کے کچھ کھلا ہنرِ ناخنِ جنوں
زخمِ جگر ہوئے لب ورخسار کی طرح

مجروحؔ لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار کی طرح

مجروحؔ سلطان پوری

مشق

لفظ و معنی

متاع	:	سامان، پونجی
کوچہ	:	گلی
راہِ شوق	:	محبّت کا راستہ

خَم	:	ٹیڑھ، بل، پیچ
گیسوئے دلدار	:	محبوب کی زلفیں
تیشہ	:	کُدال، لہٰذا 'بے تیشۂ نظر نہ چلو' کے معنی ہوئے غور کرنے والی نگاہ کو اس طرح استعمال کرو جس طرح کدال استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی پرانے خیالات جو دیوار کی طرح ہیں، انھیں اپنے غور وفکر کی طاقت سے برابر اور ہموار کردو۔
رفتگاں	:	گزرے ہوئے لوگ
نقشِ پا	:	قدموں کے نشان
اہلِ وفا	:	وفا کرنے والے لوگ

غور کرنے کی بات

- اس غزل کے اشعار میں انسان کی مختلف حیثیتوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ حیثیتیں ہیں: عاشق، انقلابی، نئی راہیں نکالنے والا
- مجروحؔ کا شمار اس دَور کے اہم ترین غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلّق انجمن ترقی پسند مصنفین سے تھا۔ ان کا کلام پُر اثر ہے اور تصنّع سے پاک ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. راہِ شوق سے کیا مراد ہے؟ ایک جملے میں لکھیے۔
2. دوسرے شعر میں 'وہ تو کہیں ہے اور' کس کی طرف اشارہ ہے؟
3. غزل کے مقطعے میں شاعر نے کیا بات کہی ہے؟

عملی کام

- غزل کو بآواز بلند پڑھیے۔
- غزل کے اشعار کو خوش خط لکھیے۔
- اس غزل کو زبانی یاد کیجیے۔
- غزل میں استعمال کی گئی تشبیہات اور استعارات کی نشاندہی کیجیے۔
- مطلب لکھیے۔

1. ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

2. سیدھی ہے راہِ شوق پہ یوں ہی کہیں کہیں
خم ہو گئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح

نظم

نظم کے معنی ''انتظام، ترتیب یا آرائش'' کے ہیں۔ عام اور وسیع مفہوم میں یہ لفظ نثر کے مدِّ مقابل کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور اس سے مراد پوری شاعری ہوتی ہے۔ اس میں وہ تمام اصناف اور اسالیب شامل ہوتے ہیں جو ہیئت کے اعتبار سے نثر نہیں ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں غزل کے علاوہ تمام شاعری کو ''نظم'' کہتے ہیں۔

عام طور پر نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم کا تانا بانا بُنا جاتا ہے۔ خیال کا تدریجی ارتقا بھی نظم کی ایک اہم خصوصیت بتایا گیا ہے۔ طویل نظموں میں یہ ارتقا واضح ہوتا ہے۔ مختصر نظموں میں یہ ارتقا واضح نہیں ہوتا اور اکثر و بیشتر ایک تاثر کی شکل میں اُبھرتا ہے۔

نظم کے لیے نہ تو ہیئت کی کوئی قید ہے اور نہ موضوعات کی۔ چنانچہ اردو میں غزل اور مثنوی کی ہیئت میں نظمیں اور آزاد و معرّا نظمیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اس طرح کوئی بھی موضوع نظم کا موضوع ہوسکتا ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے نظم کی چار قسمیں ہوسکتی ہیں:

1. پابند نظم

ایسی نظم جس میں بحر کے استعمال اور قافیوں کی ترتیب میں مقرّرہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو، پابند نظم کہلاتی ہے۔ نئے انداز کی ایسی نظمیں بھی، جن کے بندوں کی ساخت مروّجہ ہیئتوں سے مختلف ہو یا جن کے مصرعوں میں قافیوں کی ترتیب مروّجہ اصولوں کے مطابق نہ ہو، لیکن ان کے تمام مصرعے برابر کے ہوں اور ان میں قافیے کا کوئی نہ کوئی التزام ضرور پایا جائے، پابند نظمیں کہلاتی ہیں۔

.2 نظم معرّا

ایسی نظم جس کے تمام مصرعے برابر کے ہوں مگر ان میں قافیے کی پابندی نہ ہو، نظم معرّا کہلاتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے نظم عاری بھی کہا ہے۔

.3 آزاد نظم

ایسی نظم جس میں نہ تو قافیے کی پابندی کی گئی ہو اور نہ تمام مصرعوں کے ارکان برابر ہوں یعنی جس کے مصرعے چھوٹے بڑے ہوں، آزاد نظم کہلاتی ہے۔

.4 نثری نظم

نثری نظم چھوٹی بڑی نثری سطروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں ردیف، قافیے اور وزن کی پابندی نہیں ہوتی۔ آج کل نثری نظم کا رواج دُنیا کی تمام زبانوں میں عام ہے۔

حالؔی

(1837ء – 1914ء)
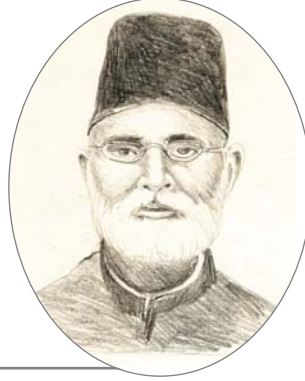
الطاف حسین حالؔی پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وطن میں اور کچھ تعلیم دہلی میں ہوئی۔ وہ اردو کے ادبی نظریہ ساز ناقد، سوانح نگار اور صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو نئی راہوں پر ڈالا۔ غزل اور قصیدے کی خامیوں کو واضح کیا۔ ان کی غزلیں اور نظمیں لطف و اثر کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کی ہیں۔ ان کے کلام میں سادگی، دردمندی اور جذبات کی پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ ان کی چار اہم کتابیں 'حیاتِ سعدی'، 'مقدمۂ شعر و شاعری'، 'یادگارِ غالبؔ' اور سرسیّد کی سوانح 'حیات جاوید' ہیں۔

مولانا حالؔی شعر و ادب کو محض مسرّت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ شاعری کی مقصدیت کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاعری زندگی کو بہتر بنانے میں مددگار ہو سکتی ہے اور دنیا میں اس سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔ وہ شاعری کے لیے تخیّل، مطالعۂ کائنات اور مناسب الفاظ کی جستجو کو ضروری سمجھتے تھے۔ حالؔی کو غالبؔ، شیفتؔہ اور سرسیّؔد کی صحبت حاصل تھی جس سے ان کے تنقیدی شعور کو جلا ملی۔

حالؔی نے ایک طویل نظم 'مدوجزرِ اسلام' مسدّس کی شکل میں لکھی جس کے بارے میں سرسیّؔد نے کہا کہ '' قیامت کے دن جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا ہے تو میں کہوں گا کہ حالؔی سے مسدّس لکھوا کر لایا ہوں۔''

تعلیم سے بے توجہی کا نتیجہ

جنھوں نے کہ تعلیم کی قدروقیمت   نہ جانی مسلّط ہوئی اُن پہ ظُلمت
ملوک اور سلاطیں نے کھوئی حکومت   گھرانوں پہ چھائی امیروں کے نکبت
رہے خاندانی نہ عزّت کے قابل
ہوئے سارے دعوے شرافت کے باطل

نہ چلتے ہیں واں کام کاریگروں کے   نہ برکت ہے پیشہ میں پیشہ وروں کے
بگڑنے لگے کھیل سوداگروں کے   ہوئے بند دروازے اکثر گھروں کے
کماتے تھے دولت جو دن رات بیٹھے
وہ اب ہیں دَھرے ہاتھ پر ہاتھ بیٹھے

ہنر اورفن واں ہیں سب گھٹتے جاتے   ہنرمند ہیں روزوشب گھٹتے جاتے
ادیبوں کے فضل وادب گھٹتے جاتے   طبیب اور ان کے مطب گھٹتے جاتے
ہوئے پست سب فلسفی اور مناظر
نہ ناظم ہیں سرسبز اُن کے نہ ناشر

اگر اک پہننے کو ٹوپی بنائیں   تو کپڑا وہ اک اور دنیا سے لائیں
جو سینے کو وہ ایک سوئی منگائیں   تو مشرق سے مغرب میں لینے کو جائیں
ہر ایک شے میں غیروں کے محتاج ہیں وہ
مِکینِکس کی رو میں تاراج ہیں وہ

جو مغرب سے آئے نہ مالِ تجارت　　تو مرجائیں بھوکے وہاں اہلِ حرفت
ہو تجّار پر بند راہِ معیشت　　دکانوں میں ڈھونڈیں نہ پائیں بضاعت
پرائے سہارے ہیں بیوپار واں سب
طفیلی ہیں سیٹھ اور تجّار واں سب

یہ ہیں ترکِ تعلیم کی سب سزائیں　　وہ کاش اب بھی غفلت سے باز اپنی آئیں
مبادا رہِ عافیت پھر نہ پائیں　　کہ ہیں بے پناہ آنے والی بلائیں
ہوا بڑھتی جاتی سرِرہ گذر ہے
چراغوں کو فانوس بن اب خطر ہے

لیے فرد بخشئ دوراں کھڑا ہے　　ہر اک فوج کا جائزہ لے رہا ہے
جنھیں ماہر اور کرتبی دیکھتا ہے　　انھیں بخشتا تیغ و طبل و نوا ہے
یہ ہیں بے ہنر یک قلم چھٹتے جاتے
رسالوں سے نام ان کے ہیں کٹتے جاتے

خواجہ الطاف حسین حالؔی

مشق

لفظ و معنی

بےتوجہی : دھیان نہ دینا، تعلق نہ رکھنا
مسلّط : چھایا ہوا، حاوی
نکبت : مفلسی، بدحالی، خواری

ظلمت	:	اندھیرا، تاریکی
باطل	:	جھوٹ
پیشہ	:	وہ کام جو روزی کمانے کے لیے کیا جائے
فضل	:	بزرگی، مہربانی
طبیب	:	علاج کرنے والا، حکیم
مطب	:	دواخانہ
ناشر	:	پھیلانے والا، یعنی کتابیں چھاپنے والا
ناظم	:	انتظام کرنے والا، سکریٹری کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔
تاراج	:	برباد
اہلِ حرفت	:	کاریگر
تجّار	:	تاجر کی جمع، تجارت کرنے والے
معیشت	:	کاروبار، روزی، سببِ زندگی
بضاعت	:	پونجی، سامان
طفیلی	:	بِن بُلایا مہمان
مبادا	:	کہیں ایسا نہ ہو، خدانخواستہ
رہِ عافیت	:	بچاؤ کا راستہ، خیریت کا راستہ
طبل	:	نقّارہ
نوا	:	آواز
رسالوں	:	رسالہ کی جمع، فوجی ٹکڑی

غور کرنے کی بات

- کسی بھی فرد، جماعت، قوم اور ملک کی ترقی کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے۔ دنیا کے وہی ممالک اور قومیں خوشحال اور ترقی پذیر ہیں جہاں کے شہریوں میں ہر طرح کی تعلیم اور علم و ہنر موجود ہے۔
- اس نظم میں ہندوستانی قوم کی تعلیم سے دوری کو موضوع بنایا گیا ہے اور تعلیم کے نہ ہونے کی وجہ سے جو نقصانات ہوتے ہیں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
- یہ نظم مسدس کے فارم (ہیئت) میں لکھی گئی ہے۔ مسدّس اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ایک بند میں چھے مصرعے ہوتے ہیں۔ اس نظم میں سادہ اور سلیس زبان کا استعمال ہوا ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. تعلیم کی قدر و قیمت کیا ہے؟
2. حکومت اور قوموں پر زوال کیسے آتا ہے؟
3. شرافت اور عزت کا معیار کیا ہے؟
4. ترکِ تعلیم کے کیا کیا نقصانات ہیں؟
5. کسی ملک اور وہاں کے عوام کی ترقّی کن چیزوں سے ہو سکتی ہے؟

عملی کام

- اس نظم کو بلند آواز سے پڑھیے۔
- نظم کے بند نمبر ایک سے چار تک خوش خط لکھیے۔

- نظم کے پہلے بند کا مطلب لکھیے۔
- درج ذیل الفاظ میں سے واحد کی جمع اور جمع کی واحد بنا کر لکھیے:

ملک، سلطان، امیروں، پیشہ وروں، سوداگروں، طبیب، منظر، تجّار، رسالوں، فوج

- تعلیم کے فوائد پر ایک مضمون لکھیے۔

پنڈت برج نرائن چکبستؔ

(1882ء – 1926ء)

پنڈت برج نرائن چکبستؔ کی ولادت ایک کشمیری خاندان میں بہ مقام فیض آباد، (اتر پردیش) میں ہوئی۔ انھوں نے لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ ہی میں وکالت کرنے لگے۔ ان کا انتقال بریلی میں ہوا اور آخری رسوم لکھنؤ میں ادا کی گئیں۔

چکبستؔ نے روایتی انداز سے شاعری شروع کی اور غزلیں بھی کہیں۔ جلد ہی وہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ وطن پرستی کو موضوع بنایا۔ چکبستؔ نے 'ہوم رول' کے موضوع پر بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ ان کی نظموں میں قدرتی مناظر کی عکّاسی، بیداریٔ وطن کے جذبات، آزادی کی تڑپ اور دردمندی کے پہلو نمایاں ہیں۔ ان کے کلام میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے احباب، بزرگوں اور قومی رہنماؤں پر مرثیے لکھ کر ان کی سیرت کی عمدہ عکّاسی کی ہے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ''صبحِ وطن'' اور مضامین کا مجموعہ ''مضامینِ چکبستؔ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

رامائن کا ایک سین

رخصت ہوا وہ باپ سے، لے کر خدا کا نام — راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام — دامن سے اشک پونچھ کر، دل سے کیا کلام
اظہارِ بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال — خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتہ سا ہوگیا ہے، یہ ہے شدّتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں، زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گُم تھی وہ بے گناہ — نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جُنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ — لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن، زباں کی طرح بولنے لگا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں — میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں — لیکن میں اپنے منھ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بَن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دُلارے کو بھیج دوں

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم　　ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت وحشم　　تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت وتاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ　　منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن واماں کی راہ　　اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجَل کرے

سن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد دردخیز　　اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز　　لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بےکس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور　　مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے یہ وفور
صدمہ یہ شاق عالم پیری میں ہے ضرور　　لیکن نہ دل سے کیجیے صبر وقرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج ومحن کا بار　　کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہ گار　　یہ جانتے نہیں وہ دانائے روزگار
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا میں جو خم رہے

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انھیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائیگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دست یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرت ِچمن آرائے روزگار وہ ابروباد و برف میں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے ان پہ فضل جو ربِّ کریم کا
موجِ سُموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرمِ کارساز پر صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہوکہ ہو حضر رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت ،دامنِ مادر سے کم نہیں

برج نارائن چکبستؔ

مشق

لفظ و معنی

زیارت : کسی متبرک مقام، چیز یا شخص کو عقیدت سے دیکھنا،کسی مقدس مقام کا سفر کرنا
ستم : ظلم

نونہال	:	پودا، کم عمر بچّہ
سکتہ	:	بے حس و حرکت ہو جانے کا مرض
ملال	:	رنج
بشر	:	انسان
تصویرِ سنگ	:	مجسمہ، پتھر کی تصویر، پتھر کی مورت
دیدۂ حسرت	:	حسرت بھری نگاہ
گوشہ ہائے چشم	:	آنکھ کے کونے
موئے تن	:	جسم کے بال
جوگی	:	فقیر
بہم	:	ساتھ ساتھ، اکٹھے
شوکت و حشم	:	شان و شکوہ، رعب داب
سرزد ہونا	:	پیش آنا، واقع ہونا
منجدھار	:	بھنور، دریا کے بیچوں بیچ
کوچ کرنا	:	روانہ ہونا
عدم	:	آخرت، غیر موجود ہونا
تقصیر	:	قصور، غلطی
بحل کرنا	:	معاف کرنا
اَجَل	:	موت
درد خیز	:	درد اٹھانے والا
گریز	:	بچنا
ناشاد	:	ناخوش

الم	:	غم
وفور	:	زیادتی
شاق	:	سخت،دشوار
عیاں	:	ظاہر
رنج ومحن	:	دکھ درد،غم،تکلیف
امرِ رضا	:	اللہ کی مرضی
خم	:	ٹیڑھاپن
ریاض	:	بہت سے باغ،مشق ومحنت (یہاں محنت کے معنوں میں استعمال ہواہے)
ناگہاں	:	اچانک
رائیگاں	:	بےکار
دستِ یاس ملنا	:	افسوس سے ہاتھ ملنا
برگِ خزاں	:	خزاں کے پتّے
موقوف	:	منحصر،ملتوی
موجِ سموم	:	گرم ہوا،جُھلسا دینے والی ہوا،لوٗ
نسیم	:	ٹھنڈی ہوا
کارساز	:	کام بنانے والا یعنی اللہ
حضر	:	ایک جگہ قیام،ٹھہراوٗ
دشت	:	جنگل
دامنِ مادر	:	ماں کی گود،ماں کی آغوش

غور کرنے کی بات

- اس نظم میں ماں اور بیٹے کے جذبات کی عکّاسی کی گئی ہے۔
- ایودھیا کے راجہ دشرتھ کی تین بیویاں تھیں۔ کوشلیا، کیکئی اور سُمترا۔ رام چندر جی کوشلیا کے بیٹے تھے۔ جب تخت پر رام چندر جی کے بیٹھنے کا وقت آیا تو ان کی سوتیلی ماں کیکئی نے اپنا لیا ہوا وعدہ راجا دشرتھ کو یاد دلایا۔ آخر کار رام چندر جی کو چودہ برس کا بن باس ملا— نظم کے اس سین میں رام چندر جی کا اپنی ماں کوشلیا سے رخصت ہونا بہت پُر درد انداز میں دکھایا گیا ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1 'راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام' یہ کہہ کر شاعر نے کس کی طرف اشارہ کیا ہے؟

2. مندرجہ ذیل الفاظ شاعر نے کس کے لیے استعمال کیے ہیں؟

صورتِ خیال، خستہ حال، شدتِ ملال، تصویرِ سنگ

3. شاعر کے خیال میں شوکت وحشم سانپ بن کر کس طرح ڈس رہا ہے؟

4. 'موئے تن زبان کی طرح بولنے' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

5. چھٹے اور ساتویں بند کی تشریح کیجیے؟

عملی کام

- اس نظم سے متضاد الفاظ تلاش کر کے لکھیے۔
- نظم میں ایک لفظ 'ناشاد' آیا ہے جس کے معنی خوش نہ ہونے کے ہیں لیکن اگر ہم اس میں سے 'نا' ہٹا دیں تو لفظ 'شاد' بن جائے گا جس کے معنی خوش ہونے کے ہیں۔ آپ بھی ایسے ہی کچھ الفاظ لکھیے جس میں 'نا' کا استعمال کیا گیا ہو۔

- اضافت کی تعریف اس سے پہلے آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس نظم میں بھی کچھ اضافتیں آئی ہیں۔ جیسے خالقِ عالم۔ آپ نظم میں آئی اضافتوں کی نشاندہی کیجیے۔
- اسی طرح کچھ الفاظ ایسے آئے ہیں جن میں دو الفاظ کے درمیان میں 'وٗ' کا استعمال ہوا ہے جیسے شوکت وحشم۔ یہ لکھتے تو 'وٗ' لگا کر ہیں لیکن پڑھتے ہیں ملا کر جیسے (شوکتو حشم) دو لفظوں کو اس طرح ملانے والے 'وٗ' کو حرفِ عطف کہتے ہیں۔ آپ اس نظم میں سے اس طرح کے الفاظ کو تلاش کر کے لکھیے جن میں عطف کا استعمال ہوا ہو۔
- مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی لکھیے اور اُنھیں جملوں میں استعمال کیجیے:

بہم، اشک ریز، خالقِ عالم، عیاں، رنج ومحن، منجدھار، الم، وفور

محمد اقبال

(1877ء – 1938ء)

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے سیالکوٹ ہی میں امتیاز کے ساتھ انٹرنس کا امتحان پاس کیا پھر لاہور میں اعلیٰ تعلیم پائی۔ کچھ دن بعد وہ یوروپ گئے اور انگلستان سے قانون کی اور جرمنی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

ابتدائی تعلیم کے زمانے ہی سے اقبال شعر کہنے لگے تھے۔ اقبال نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی اور داغ سے اصلاح لی۔ آگے چل کر انھوں نے اپنی شاعری کو اپنے پیغام اور فکر کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ وہ حرکت و عمل اور خودی کی تعلیم دیتے ہیں اور ان خوبیوں کو انسانیت کی بقا کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے کلام میں موسیقیت اور زورِ بیان ہے۔ انھوں نے لفظوں کے انتخاب میں بڑی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اسی لیے ان کے اشعار میں خوش آہنگی بہت ہے۔ اردو میں ان کے مجموعے 'بانگِ درا'، 'بالِ جبریل'، 'ضربِ کلیم' اور 'ارمغانِ حجاز' ہیں۔ فارسی میں ان کی شاعری کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔

اقبال کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا ہندوستانی شاعر کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ہندوستانیوں اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کو ذہنی اور تہذیبی غلامی سے آزاد کرایا اور یورپ کے علوم سے مرعوب ہونے کے بجائے یورپ سے استفادہ کرنا سکھایا اور یہ بتایا کہ یورپ کی تہذیب مادہ پرستی اور بے انصافی پر مبنی ہے اور اسے بہت جلد زوال آجائے گا۔

اقبال کی شاعری میں فلسفہ، تغزل، ڈراما، پیغامِ عمل اور مذہبِ اسلام سب اس طرح گھل مل کر ایک ہوگئے ہیں کہ وہ اپنی طرح کی بے نظیر چیز بن گئی ہے۔

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب
کیا لُطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں، عُزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نِکل گیا ہو

لذّت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گُل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجکو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا، سبزہ کا ہو بچھونا!
شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بُلبل
ننّھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندّی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جُھک جُھک کے گُل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دُلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
اُمّید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے اُن کو کُٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذّن — میں اس کا ہم نوا ہوں، وہ میری ہم نوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر وحرم کا احساں! — روزن ہی جھونپڑی کا مجکو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے — رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دُعا ہو!
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے — تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید اُنھیں جگا دے

محمد اقبالؔ

مشق

لفظ و معنی

شورش	:	شور وغُل، اُتھل پُتھل
سکوت	:	خاموشی
تقریر	:	بیان، بات
عُزلت	:	تنہائی، گوشہ
سرود	:	گانا، نغمہ
جہاں نما	:	جس میں یا جس سے تمام دنیا نظر آئے
جلوت	:	محفل، لوگوں کی موجودگی
دل فریب	:	دل کو لبھانے والا، من موہن
قبا	:	جسم کے اوپری حصے کی پوشاک

ہم نوا	:	ہم آواز
روزن	:	سوراخ، روشن دان
سحر نما	:	صبح کا دیدار کرانے والا
نالہ	:	فریاد، رونے کی آواز
درا	:	قافلے کے روانہ ہونے سے پہلے بجنے والا گھنٹہ، جرس

غور کرنے کی بات

- کسی شعر یا شعر کے کسی مصرعے میں دو متضاد الفاظ کے استعمال کو صنعتِ تضاد کہتے ہیں۔ اس نظم میں کئی اشعار ایسے ہیں جن میں دو متضاد الفاظ آئے ہیں۔ جیسے

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا، سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو

- 'جہاں نما' ایک مرکّب ہے جو 'جہاں' بمعنی 'دنیا' اور 'نما' بمعنی دکھانے والا، سے مل کر بنا ہے۔ جب دو مختلف الفاظ ایک ساتھ مل کر ایک ترکیب بناتے ہیں تو اسے مرکّب کہتے ہیں۔
- شعر میں کسی تاریخی واقعے، مشہور شخصیت یا شے کا ذکر کیا جائے تو اسے صنعتِ تلمیح کہتے ہیں۔ 'ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو' اس مصرعے میں صنعتِ تلمیح کا استعمال کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم ایرانی بادشاہ جمشید کے پاس ایک پیالہ تھا جس میں وہ پوری دنیا کو دیکھ لیتا تھا۔ یہاں کلی کو استعارتاً ساغر کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور ساغر کے لیے جہاں نما کی تلمیح سے مدد لی گئی ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. شاعر نے تنہائی کی کیا خوبیاں بیان کی ہیں؟ وضاحت کیجیے۔
2. پہاڑ کے دامن میں وہ کون سی چیزیں ہیں جن میں شاعر کو خاص دلچسپی ہے؟
3. شاعر کی آرزو کے مطابق رات کے مسافروں کی اُمّید کیا ہوگی؟
4. آخری شعر میں شاعر کیا بات کہنا چاہتا ہے؟

عملی کام

- نظم 'ایک آرزو' بلند آواز سے پڑھیے۔
- اقبال کے مجموعے 'بانگِ درا' میں کئی نظمیں بچّوں کے لیے ہیں۔ آپ ان نظموں کو تلاش کر کے پڑھیے۔
- درج ذیل اشعار کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی مؤذّن
میں اس کا ہم نوا ہوں وہ میری ہم نوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر وحرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دُلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

- نظم سے ایسے دو اشعار لکھیے جن میں تشبیہ کا استعمال ہوا ہے۔
- درج ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

جہاں نما، سحر نما، ہم نوا، دل فریب، جلوت، خلوت

فیض احمد فیضؔ

(1911ء – 1984ء)

فیضؔ سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم چرچ مشن اسکول، سیالکوٹ سے حاصل کی۔ انگریزی سے ایم۔اے کرنے کے بعد امرتسر کے ایک کالج میں لیکچرر مقرّر ہوئے۔ بعد میں انھوں نے فوج میں ملازمت کی۔ پھر انگریزی صحافت میں سرگرم رہے۔ انھیں 'راولپنڈی سازش کیس' میں شریک ہونے کی جرم میں کئی سال تک قید و بند کی سزا بھی بھگتنی پڑی۔ فیضؔ کا انتقال لاہور میں ہوا۔

فیضؔ غزل اور نظم دونوں میں ممتاز ہیں۔ انھوں نے غزل کی کلاسیکی روایت سے استفادہ کیا اور اسے انقلابی فکر سے ہم آہنگ کر کے ایک بالکل نئی کیفیت پیدا کی۔ فیضؔ اہم ترین ترقی پسند شاعر تھے۔ انھوں نے جلاوطنی کی زندگی بھی گزاری لیکن وہ حق و انصاف کے لیے برابر آواز اُٹھاتے رہے۔ ان کی شاعری میں دردمندی، دل آویزی اور تاثیر ہے۔ مختلف زبانوں میں ان کے کلام کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ ان کے مجموعے 'نقشِ فریادی'، 'دستِ صبا'، 'زنداں نامہ'، 'دستِ تہِ سنگ'، 'سرِ وادیٔ سینا'، 'شامِ شہرِ یاراں' اور 'مرے دل مرے مسافر' وغیرہ ہیں۔ ان کا کلّیات 'نسخہ ہائے وفا' کے نام سے شائع ہوا۔

بول

بول ، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا سُتواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تُند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھُلنے لگے قُفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم وزباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

فیض احمد فیضؔ

مشق

لفظ و معنی

سُتواں : سیدھا۔ عام طور پر یہ لفظ 'ستواں' سیدھا اور سیدھی ناک کے لیے بولا جاتا ہے (جیسے ستواں ناک) لیکن شاعر نے یہاں 'ستواں جسم' لکھا ہے۔

آہن گر : لوہار

تُند : تیز

آہن : لوہا

دہانہ : دہن کی وسعت، جبڑے

غور کرنے کی بات

- اس نظم میں اظہارِ خیال کی آزادی پر زور دیا گیا ہے۔
- دنیا میں حق و باطل کی جنگ برابر جاری رہتی ہے لیکن دنیا کی فلاح کے لیے حق یعنی سچ کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے۔
- سچ کو زندہ رکھنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور آزادیٔ اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔
- سچ کو دبانے کے لیے سچ کے خلاف بہت سی طاقتیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ انھیں کُچلنا ضروری ہے اور اس کے لیے حق بات بولتے رہنا لازمی ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. وہ کون سے حالات ہیں جن کے خلاف انسان کا بولنا ضروری ہے؟

2. بولنا فوری طور پر کیوں ضروری ہے؟ اور اسے کیوں نہیں ٹالا جاسکتا؟
3. تمام مخالفتوں کے باوجود ایک چیز بولنے والے کے حق میں ابھی باقی ہے، وہ کیا ہے؟

عملی کام

- اس نظم کو بلند آواز سے پڑھیے اور زبانی یاد کیجیے۔
- نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

رشید احمد صدّیقی

(1896ء - 1977ء)

رشید احمد صدّیقی اتر پردیش کے شہر جون پور کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم جون پور میں حاصل کی اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کی غرض سے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد وہیں ملازم ہو گئے۔ جب علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم ہوا، تو رشید احمد صدّیقی اس کے صدر بنائے گئے۔ انھیں علی گڑھ بہت عزیز تھا اور انھوں نے ساری زندگی وہیں گزاری۔

رشید احمد صدّیقی نے طالب علمی کے زمانے ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے مضامین طنز اور ظرافت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ وہ عموماً اشاروں، کنایوں اور چبھتے ہوئے جملوں میں اپنی بات کہتے ہیں۔ ملتے جُلتے لفظوں اور متضاد لفظوں کو وہ ایک نئے انداز سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں تنوّع ہے۔ معاشرتی، سیاسی اور ادبی مسائل پر جب وہ قلم اٹھاتے ہیں تو ان کے طرزِ تحریر کو سمجھنے والا قاری ان کی نکتہ رسی کی داد دیے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے یہاں دلچسپ فقروں، نادر تشبیہوں، معنی خیز اشاروں، برجستہ لطیفوں اور پُر لطف اندازِ بیان کی وجہ سے نرالی ادبی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ رشید احمد صدّیقی کو ''ادبی مزاح نگاری'' کے میدان میں سب سے پہلا اور بعض لوگوں کی نظر میں اہم ترین مصنف قرار دیا جاتا ہے۔ ان دنوں مشتاق احمد یوسفی اس طرز کے بہترین نمائندے ہیں۔

رشید احمد صدّیقی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے 1963ء میں انھیں

'پدم شری' کا اعزاز عطا کیا۔ ان کو ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ ان کا انتقال علی گڑھ میں ہوا۔

'مضامینِ رشید' (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) 'خنداں' (ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ) 'گنج ہائے گراں مایہ' اور 'ہم نفسانِ رفتہ' (خاکوں کے مجموعے) 'طنزیات و مضحکات' اور 'جدید غزل' (تنقید) اور 'آشفتہ بیانی میری' (خودنوشت) رشید احمد صدّیقی کی اہم تصانیف ہیں۔

چار پائی

چار پائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہم اسی پر پیدا ہوتے ہیں اور یہیں سے مدرسے، آفس، جیل خانے، کونسل، یا آخرت کا راستہ لیتے ہیں۔ چار پائی ہماری گھٹّی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم اس پر دوا کھاتے ہیں، دعا و بھیک بھی مانگتے ہیں۔ کبھی فکرِ سخن کرتے ہیں اور کبھی فکرِ قوم۔ اکثر فاقہ کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ہم کو چار پائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا برطانیہ کو آئی۔سی۔ایس پر، شاعر کو قافیہ پر، یا طالب علم کو غل غپاڑے پر۔

چار پائی کی مثال ریاست کے ملازم سے دے سکتے ہیں۔ یہ ہر کام کے لیے ناموزوں ہوتا ہے، اس لیے ہر کام پر لگا دیا جاتا ہے۔ ایک ریاست میں کوئی صاحب 'ولایت پاس' ہو کر آئے۔ ریاست میں کوئی اسامی نہ تھی جو ان کو دی جا سکتی۔ آدمی سوجھ بوجھ کے تھے، راجا صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ کوئی جگہ نہ ملی تو وہ لاٹ صاحب سے طے کر آئے ہیں، راجا صاحب ہی کی جگہ پر اکتفا کریں گے۔ ریاست میں ہلچل مچ گئی۔ اتّفاق سے ریاست کے سِول سرجن رخصت پر گئے ہوئے تھے، یہ ان کی جگہ پر تعینات کر دیے گئے۔ کچھ دنوں بعد سول سرجن صاحب واپس آئے تو انجینیر صاحب پر فالج گرا۔ ان کی جگہ ان کو دے دی گئی۔ آخری بار یہ خبر سنی گئی کہ وہ ریاست کے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہو گئے تھے اور اپنے ولی عہد کو ریاست کے ولی عہد کا مصاحب بنوا دینے کی فکر میں تھے۔

یہی حالت چار پائی کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان ملازم صاحب سے کہیں زیادہ کار آمد ہوتی ہے۔ فرض کیجیے آپ بیمار ہیں، سفرِ آخرت کا سامان میسّر ہو یا نہ ہو، اگر چار پائی آپ کے پاس ہے تو دنیا میں آپ کو کسی اور چیز کی حاجت نہیں۔ دوا کی پڑیا تکیے کے نیچے، جوشاندے کی دیگچی

سرہانے رکھی ہوئی، چارپائی سے ملا ہوا بول و براز کا برتن، چارپائی کے نیچے میلے کپڑے، بچّوں کے کھلونے، جھاڑو، آشِ جو، روئی کے پھاہے، کاغذ کے ٹکڑے، مچھّر، بھنگے، گھریا محلے کے دو ایک بچّے، جن میں ایک آدھ زکام خسرے میں مبتلا۔ اچھّے ہو گئے تو بیوی نے چارپائی کھڑی کر کے غسل کرادیا، ورنہ آپ کے دشمن اسی چارپائی پر لبِ گور لائے گئے۔

ہندوستانی گھرانوں میں چارپائی کو ڈرائنگ روم، سونے کا کمرہ، غسل خانہ، قلعہ، خانقاہ، خیمہ، دواخانہ، صندوق، کتاب گھر، شفاخانہ، سب کی حیثیت کبھی کبھی بہ یک وقت ورنہ وقت وقت پر حاصل رہتی ہے۔ کوئی مہمان آیا، چارپائی نکالی گئی۔ اس پر ایک نئی دری بچھادی گئی، جس کے تہہ کے نشان ایسے معلوم ہوں گے جیسے کسی چھوٹی سی آراضی کو مینڈوں اور نالیوں سے بہت سے مالکوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور مہمان صاحب مع اچکن، ٹوپی، بیگ بغچی کے بیٹھ گئے۔ اور تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہو گیا کہ مہمان بے وقوف ہے یا میزبان بدنصیب! چارپائی ہی پر ان کا منھ ہاتھ دھلوایا اور کھانا کھلایا جائے گا اور اسی چارپائی پر یہ سورہیں گے۔ سوجانے کے بعد ان پر سے مچھّر مکھّی اسی طرح اڑائی جائے گی جیسے کوئی پھیری والا اپنے خوانچے پر سے جھاڑو نما مورچھل سے مکھّیاں اڑا رہا ہو۔

چارپائی پر سوکھنے کے لیے اناج پھیلایا جائے گا، جس پر تمام دن چڑیاں حملے کرتی، دانے چگتی اور گالیاں سنتی رہیں گی۔ کوئی تقریب ہوئی تو بڑے پیمانے پر چارپائی پر آلو چھیلے جائیں گے۔ ملازمت میں پنشن کے قریب ہوتے ہیں تو جو کچھ رخصت جمع ہوتی رہتی ہے، اس کو لے کر ملازمت سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔ اس طرح چارپائی پنشن کے قریب پہنچتی ہے تو اس کو کسی کال کوٹھری میں داخل کر دیتے ہیں اور اس پر سال بھر کا پیاز کا ذخیرہ جمع کر دیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ دیہات کے ایک میزبان نے پیاز ہٹا کر اس خاکسار کو ایسی ہی ایک پنشن یافتہ چارپائی پر اسی کال کوٹھری میں بچھا دیا تھا اور پیاز کو چارپائی کے نیچے اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ اس رات کو مجھ پر آسمان کے اتنے ہی طبق روشن ہو گئے تھے، جتنی ساری پیازوں میں چھلکے تھے اور وہ یقیناً چودہ سے زیادہ تھے۔

چار پائی ایک اچھّے بکس کا بھی کام دیتی ہے، تکیے کے نیچے ہر قسم کی گولیاں، جن کے استعمال سے آپ کے سوا کوئی واقف نہیں ہوتا، ایک آدھ روپیہ، چند دھیلے پیسے، اسٹیشنری، کتابیں، رسالے، جاڑے کے کپڑے، تھوڑا بہت ناشتہ، نقشِ سلیمانی، فہرست دواخانہ، سمّن، جعلی دستاویز کے کچھ مسوّدے، یہ سب چار پائی میں آباد ملیں گے۔ میں ایک ایسے صاحب سے واقف ہوں جو چار پائی پر لیٹے لیٹے ان میں سے ہر ایک کو، اجالا ہو یا اندھیرا، اس صحت کے ساتھ آنکھ بند کر کے نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے، جیسے حکیم نابینا صاحب مرحوم اپنے لمبے چوڑے بکس میں سے ہر مرض کی دوائیں نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے تھے۔

حکومت بھی چار پائی ہی پر سے ہوتی ہے۔ خاندان کے کرتا دَھرتا چار پائی ہی پر براجمان ہوتے ہیں۔ وہیں سے ہر طرح کے احکام جاری ہوتے رہتے ہیں اور گناہ گار کو سزا بھی وہیں سے دی جاتی ہے۔ آلاتِ سزا میں ہاتھ، پاؤں، زبان کے علاوہ ڈنڈا، جوتا، تاملوٹ بھی ہیں جنھیں اکثر پھینک کر مارتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ توقف کرنے میں غصّے کا تاؤ مدھم نہ پڑ جائے اور ان آلات کو مجرم پر استعمال کرنے کے بجائے اپنے اوپر استعمال کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہونے لگے۔

چار پائی ہی کھانے کا کمرہ بھی ہوتی ہے۔ باورچی خانے سے کھانا چلا اور اس کے ساتھ پانسات چھوٹے بڑے بچّے، اتنی ہی مرغیاں، دو ایک کتّے، بلّی، اور بے شمار مکھّیاں آ پہنچیں۔ سب اپنے قرینے سے بیٹھ گئے۔ صاحبِ خانہ صدر دستر خوان ہیں۔ ایک بچّہ زیادہ کھانے پر مار کھاتا ہے، دوسرا بدتمیزی سے کھانے پر، تیسرا کم کھانے پر، چوتھا زیادہ کھانے پر اور بقیہ اس پر کہ ان کو مکھّیاں کھائے جاتی ہیں۔ دوسری طرف بیوی مکھّی اڑاتی جاتی ہے اور شوہر کی بدزبانی سنتی اور بدتمیزی سہتی جاتی ہے۔ کھانا ختم ہوا۔ شوہر شاعر ہوئے تو ہاتھ دھو کر فکرِ سخن میں چار پائی ہی پر لیٹ گئے۔ کہیں دفتر میں ملازم ہوئے تو اس طرح جان لے کر بھاگے جیسے گھر میں آگ لگی ہے۔ اور کوئی مذہبی آدمی ہوئے تو اللہ کی یاد میں قیلولہ کرنے لگے، بیوی بچّے بدن دبانے لگے۔

چار پائی ہندوستان کی آب و ہوا، تمدن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا سب سے بھرپور

نمونہ ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے مانند ڈھیلی ڈھالی، شکستہ حال، بے سروسامان، لیکن ہندوستانیوں کی طرح غالب اور حکمراں کے لیے ہر قسم کا سامانِ راحت فراہم کرنے کے لیے آمادہ، کوچ اور صوفے کے دلدادہ اور ڈرائنگ روم کے اسیر اس راحت و عافیت کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں جو چارپائی پر میسّر آتی ہے! شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے کچھ باتیں منتخب کر لی ہیں، مثلاً سچّے دوست، شرافت، فراغت، اور گوشۂ چمن۔ ہندوستان جیسے ملک کے لیے عیش و فراغت کی فہرست اس سے مختصر ہونی چاہیے۔ میرے نزدیک تو صرف ایک چارپائی ان تمام لوازم کو پورا کر سکتی ہے۔

رشید احمد صدیقی

مشق

لفظ و معنی

فکرِ سخن کرنا	:	شعر کہنا، شعر کہنے کی کوشش کرنا
آئی۔سی۔ایس	:	انڈین سول سروس (Indian Civil Service)۔ انگریزوں کے زمانے کی انتظامی ملازمت کی سروس جسے اب آئی۔اے۔ایس (انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس - Indian Administrative Service) کہتے ہیں۔
غل غپاڑے	:	شور و غل، فقرہ، بے تکلفی اور شگفتگی کے انداز میں استعمال کیا جاتا ہے۔
اسامی	:	نوکری، منصب

اکتفا کرنا	:	قناعت کرنا، مطمئن رہنا
مصاحب	:	درباری
بول	:	پیشاب
براز	:	پاخانہ
پانسات	:	پانچ سات، یہ تلفظ بول چال کے لہجے یا بے تکلف تحریر میں استعمال ہوتا ہے
طبق	:	درجہ، منزل، حصّہ
چودہ طبق روشن ہونا	:	دماغ یا طبیعت کا خوب کھل جانا، مزاج میں پوری طرح بحالی آجانا۔ مصنّف نے اس محاورے کو آسمان کے طبقوں سے متعلق کر کے نیا لطف پیدا کیا ہے۔ آسمان کے بھی طبقے فرض کیے جاتے ہیں۔
آشِ جَو	:	جَو کا جوش دیا ہوا پانی جو کمزور مریضوں کو دیا جاتا ہے
لبِ گور	:	مرنے کے قریب (لفظی معنی قبر کے کنارے)
آراضی	:	زمین، کھیت
سبک دوش	:	فارغ
نقشِ سلیمانی	:	کوئی تعویذ یا دعا، عملیات کی مشہور کتاب
تاملوٹ	:	بغیر ٹونٹی کا لوٹا، ڈونگا
سَمّن	:	انگریزی (Summon) عدالت میں حاضر ہونے کا تحریری حکم نامہ
قیلولہ	:	دوپہر کے کھانے کے بعد کی مختصر نیند

غور کرنے کی بات

- رشید احمد صدّیقی کا شمار اردو کے معروف انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی نثر ظرافت کا اعلا نمونہ ہے۔ وہ عام طور پر اپنی تحریروں میں سیاسی، معاشرتی اور ادبی مسائل کا ذکر کرتے ہیں اور ان کو دلچسپ بنانے کے لیے نادر تشبیہات، متضاد الفاظ اور رمز و اشارہ سے کام لیتے ہیں۔ ان کے طنز کا وار بھرپور ہوتا ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. رشید احمد صدّیقی نے 'چارپائی' کو ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا کیوں کہا ہے؟
2. رشید احمد صدّیقی نے 'چارپائی' کی مثال ریاست کے ملازم سے کیوں دی ہے؟
3. ہندوستانی گھرانوں میں چارپائی کو کس کس کام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے؟
4. مصنّف نے چارپائی کو ضرورت اور ایجاد کا سب سے بھرپور نمونہ کیوں کہا ہے؟
5. چارپائی میں رشید احمد صدّیقی نے عام ہندوستانی رہن سہن کا جو نقشہ کھینچا ہے، اسے مختصر لکھیے۔

عملی کام

- چارپائی کا جو پیراگراف آپ کو پسند ہو اُسے اپنی کاپی میں خوش خط نقل کیجیے۔
- اس سبق میں جو محاورے استعمال کیے گئے ہیں، ان میں سے کوئی پانچ محاورے تلاش کیجیے اور ان کے معنی بھی لکھیے۔
- درج ذیل الفاظ کے واحد لکھیے:

ملازمین، طلبا، کتب، تقاریب، مجرمین

میراؔجی

(1912ء – 1949ء)

میراؔجی کا اصلی نام محمد ثناء اللہ ڈار تھا۔ وہ ایک کشمیری خاندان میں گوجرانوالہ، پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ان کا زیادہ وقت لاہور، دلّی اور ممبئی میں گزرا۔ وہ انتہائی ذہین انسان تھے۔ مطالعے کا انھیں بہت شوق تھا، اس لیے انھوں نے مختلف زبانوں کی شاعری کا مطالعہ کیا، تراجم کیے اور مضامین لکھے۔ وہ لاہور کی ایک مشہور ادبی انجمن 'حلقۂ اربابِ ذوق' کے بانیوں میں تھے، جس نے بہت سے ذہنوں کو متاثر کیا اور شاعری میں جدید رجحانات کو فروغ دیا۔ انھوں نے اختر الایمان کے ساتھ مل کر رسالہ 'خیال' نکالا جس کے چند ہی شمارے شائع ہو سکے۔ ممبئی میں ہی ان کا انتقال ہوا۔ میراجی کی نظموں کے کئی مجموعے مثلاً 'میراجی کی نظمیں' اور گیتوں کا مجموعہ 'گیت ہی گیت' ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔ ایک مجموعہ 'پابند نظمیں' اور انتخاب 'تین رنگ' بعد میں شائع ہوئے۔ بہت بعد میں پاکستان سے 'کلیات میراؔجی' (مرتبہ جمیل جالبی) اور 'باقیات میراؔجی' (مرتبہ شیما مجید) شائع ہوئے۔ نثر میں دو کتابیں 'مشرق ومغرب کے نغمے' اور 'اس نظم میں' معروف ہیں۔

جدید تنقید میں بھی میراجی کا نام بہت بلند ہے۔ انھوں نے نظم کا تجزیہ لکھنے کی ایک نئی رسم کو فروغ دیا۔ ہندوستان اور یورپ کے نئے پرانے شاعروں پر بہت اچھے مضامین لکھے۔ میراجی کی بہت سی شاعری میں جنسی خیالات اور تجربات پیش کیے گئے ہیں۔

سُکھ کی تان

اب سُکھ کی تان سنائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی
اب سُکھ نے بدلا بھیس نیا　　اب دیکھیں گے ہم دیس نیا
جب دل نے رام دہائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی
اس دیس میں سب اَن جانے ہیں　　اپنے بھی یہاں بیگانے ہیں
پیتم نے سب سے رہائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی
ہر رنگ نیا، ہر بات نئی　　اب دن بھی نیا اور رات نئی
اب چین کی راہ سُجھائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی
اب اپنا محل بنائیں گے　　اب اور کے در پہ نہ جائیں گے
اک گھر کی راہ سُجھائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی

میراجیؔ

مشق

لفظ و معنی

تان	:	کھینچ کر نکالی جانے والی سُریلی آواز
رام دہائی	:	اللہ کی پناہ
پیتم	:	محبوب، شوہر
در پہ نہ جانا	:	کسی اور کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا

غور کرنے کی بات

- اس نظم میں ایک سیدھی سادی، ہندوستانی لڑکی کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ جو ایک نئی زندگی کے ارمان لیے ہوئے ہے جس میں وہ اپنا نیا گھر بسانے کا خواب دیکھتی ہے اور گنگناتی ہے۔
- یہ گیت سادہ زبان میں لکھا گیا ہے جو پُر تاثیر بھی ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. اس گیت میں لڑکی کس نئی دنیا میں قدم رکھ رہی ہے؟
2. 'اب سکھ نے بدلا بھیس نیا' سے کیا مراد ہے؟
3. 'اپنا محل بنانا اور دوسرے کے در پہ نہ جانا' کے کیا معنی ہیں؟

عملی کام

- اس گیت کو بلند آواز سے پڑھیے۔
- اس گیت کے پہلے بند کو خوش خط لکھیے اور اس کا مطلب بھی لکھیے ۔
- گیت کو زبانی یاد کیجیے۔

قطعہ

رُباعی کی طرح قطعہ بھی عام طور پر چار مصرعوں کی نظم ہوتا ہے۔لیکن رُباعی اور قطعے میں دو باتوں کے لحاظ سے بنیادی فرق ہے۔رُباعی کے لیے ایک بحر اور اس کی کچھ شکلیں مخصوص ہیں اور رُباعی کے تین مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔اس کے چاروں مصرعے بھی ہم قافیہ ہو سکتے ہیں اس کے برخلاف قطعے کی شرط یہ ہے کہ اس میں مطلع نہیں ہوتا،یعنی اس کے پہلے کے دونوں مصرعے ہم قافیہ نہیں ہوتے۔ قطعہ کلاسیکی شاعروں کے یہاں عموماً غزل کے اشعار میں ملتا ہے۔قطعہ بند اشعار غزل کے اندر دو بھی ہو سکتے ہیں اور دو سے زائد بھی۔لیکن آج کل کے زیادہ تر شعرا نے قطعے کو رُباعی کی طرح صرف چار مصرعوں تک محدود کر دیا ہے۔

وحیدالدّین سلیم

(1859ء – 1928ء)

وحیدالدین سلیم ماہرِ لسانیات، صحافی، مترجم، کامیاب مصنف اور شاعر تھے۔ اُنھوں نے پہلے مفتوں اور پھر سلیم تخلص اختیار کیا۔ پانی پت میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ کم عمری میں والد کا انتقال ہوگیا۔ 1882ء میں مڈل اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد لاہور کے اورینٹل کالج میں تعلیم جاری رکھی۔ طالب علمی کا زمانہ غُربت میں بسر ہوا۔ ایک دوست کی وساطت سے ایجرٹین کالج بھاولپور میں السنۂ مشرقیہ کے استاد کی جگہ پر ان کا تقرر ہوگیا۔ حالی نے 1894ء میں انھیں علی گڑھ بلوایا اور سرسیّد سے ملاقات کروائی۔ 1907ء میں 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کی ادارت کے لیے انھیں مدعو کیا گیا۔ قیام علی گڑھ میں وحیدالدین سلیم نے 'انجمن مترجمین' قائم کی تھی جس کا مقصد انگریزی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا تھا۔ جب حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ قائم کی گئی تو نصاب کی کتابوں کو طالب علموں کے لیے اردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ راس مسعود اور بعض دوسرے حضرات نے سلیم کو حیدرآباد بلوالیا۔ یہاں ترجمے کے کام کو آگے بڑھانا تھا۔ جس کے لیے 'وضع اصطلاحات' کی کمیٹی بنائی گئی۔ اس میں مختلف علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے سلسلے میں اصطلاحات سازی کی ضرورت پیش آئی۔ جب شعبۂ اُردو کا قیام عمل میں آیا تو انھیں پروفیسر مقرر کردیا گیا۔ آخری زمانے میں صحت کی خرابی کے باعث ملیح آباد چلے گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

دعوتِ انقلاب

کیا لے گا خاک ! مُردۂ اُفتادہ بن کے تو — طوفان بن، کہ ہے تری فطرت میں انقلاب
کیوں ٹمٹمائے کرمکِ شب تاب کی طرح! — بن سکتا ہے تو اوجِ فلک پر اگر شہاب
وہ خاک ہو، کہ جس سے مِلیں ریزہ ہائے زر — وہ سنگ بن کہ جس سے نکلتے ہیں لعلِ ناب
چڑیوں کی طرح دانے پہ گرتا ہے کس لیے — پرواز رکھ بلند، کہ تو بن سکے عقاب

وہ چشمہ بن کہ جس سے ہوں سرسبز کھیتیاں
رہرو کو تو فریب نہ دے صورتِ سراب

وحیدالدّین سلیم

مشق

لفظ و معنی

افتادہ : گرا پڑا ہوا
کرمکِ شب تاب : جگنو
اوج : بلندی، شان، عروج
شہاب : ستارہ کا نام
لعل ناب : گہرے سرخ رنگ کا قیمتی پتھّر

عقاب : چیل کی شکل کے ایک بڑے پرندے کا نام

سراب : ریگزار جس پر دور سے پانی کا گمان ہو، مطلب فریب نظر یا دھوکا

غور کرنے کی بات

- اس قطعے میں انسانی قوت اور اس کی خوبیوں کو بیان کیا گیا ہے اور اس بات کا احساس دلایا گیا ہے کہ اگر انسان چاہے تو اپنی کوششوں سے ہر مشکل کو آسان بنا سکتا ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. انقلاب سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
2. انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت کس میں ہے؟
3. شاعر انسان کو کس طرح کا چشمہ بننے کے لیے کہہ رہا ہے؟
4. شاعر انسان کو چڑیا بننے کے بجائے عقاب بننے کی ترغیب کیوں دے رہا ہے؟

عملی کام

- اس قطعے کو بلند آواز سے پڑھیے۔
- اس قطعے کے آخری تین اشعار خوشخط لکھیے۔
- درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے:

اوج، مردہ، فلک، سرسبز

- اس قطعے میں شاعر نے جن الفاظ کے ساتھ اضافت کا استعمال کیا ہے، اُن کی نشاندہی کیجیے۔

اخترؔ انصاری

(1909ء – 1988ء)

اختر انصاری، بدایوں (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دہلی اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گئے مگر والد کی علالت کے باعث جلد واپس آ گئے۔ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے اس کے بعد ٹریننگ کالج میں بحیثیت لیکچرر ان کا تقرّر ہوا۔ 1974ء میں وہ ریٹائر ہوئے اور آخر وقت تک علی گڑھ ہی میں رہے۔

اُن کی ادبی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے میں ہوا۔ وہ شروع میں شیلؔی اور کیٹسؔ سے متاثر ہوئے لیکن بعد میں انھوں نے ترقی پسند ادبی تحریک کے اثرات قبول کیے اور شاعری کو سیاسی اور سماجی شعور کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اختر انصاری نے افسانے بھی لکھے اور تنقید بھی لیکن انھیں شہرت قطعات سے ملی۔ ’ایک ادبی ڈائری‘، ’افادی ادب‘، ’غزل کی سرگزشت‘، ’غزل اور غزل کی تعلیم‘ ان کی نثری تصنیفات ہیں۔ ’نغمۂ روح‘، ’روحِ عصر‘، ’دہانِ زخم‘، ’خندۂ سحر‘، ’درد و داغ‘، ’شعلہ بجام‘، ’آبگینے‘ اختر انصاری کے مجموعے ہیں۔

امکانات

قدم آہستہ رکھ کہ ممکن ہے

کوئی کونپل زمیں سے پھوٹتی ہو

یا کسی پھول کی کلی سرِ دست

مزے خوابِ عدم کے لوٹتی ہو

مشق

لفظ و معنی

سرِ دست : فی الحال، ابھی

عَدم : وہ دنیا، جہاں انسان مرنے کے بعد جاتا ہے، وجود کا نہ ہونا

غور کرنے کی بات

- اس قطعے میں اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ ہمیں زندگی کو احتیاط کے ساتھ، دوسروں کا خیال رکھتے ہوئے گزارنا چاہیے یا اس طرح جینا چاہیے کہ دوسروں کو دشواری نہ ہو۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. کلی کا خوابِ عدم کے مزے لوٹنے سے کیا مراد ہے؟
2. اس قطعے میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟

عملی کام

- اس قطعے کو زبانی یاد کیجیے اور خوشخط لکھیے۔

آرزو

دل کو برباد کیے جاتی ہے
غم بدستور دیے جاتی ہے
مَر چکیں ساری امیدیں اختؔر
آرزو ہے کہ جیے جاتی ہے

مشق

لفظ و معنی

برباد	:	تباہ
بدستور	:	ہمیشہ کی طرح، مسلسل

غور کرنے کی بات

- اس قطعے میں شاعر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حالات کسی قدر ناخوشگوار ہوں تب بھی جینے کی آرزو ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. 'آرزو ہے کہ جیے جاتی ہے' سے کیا مُراد ہے؟
2. اس قطعے میں کیا بات کہی گئی ہے؟

عملی کام

- قطعے کو بلند آواز سے پڑھیے اور زبانی یاد کیجیے۔
- قطعے کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں لکھیے۔

شَبِ پُر بَہار

اندھیری رات، خموشی، سرور کا عالم
بھری ہے قہر کی مَستی ہوا کے جھونکوں میں
سُکوت بَن کے فَضاؤں پہ چھا گئی ہے گھَٹا
بَرس رہی ہیں خُدا جانے کیوں مری آنکھیں

اختر انصاری

مشق

لفظ و معنی

سُرور : نشہ

قہر : غضب

سُکوت : خاموشی

سوالوں کے جواب لکھیے

1. اس قطعے میں شاعر نے فطرت کی کن کیفیات کو بیان کیا ہے؟
2. ہوا کے جھونکوں میں کیسی مستی بھری ہوئی ہے؟

مثنوی

مثنوی، مُسلسل اشعار کے ایسے مجموعے کو کہتے ہیں جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کے قافیے الگ الگ ہوتے ہیں۔

مثنوی کے اشعار کی تعداد مقرّر نہیں ہے۔ اُردو میں طویل اور مختصر دونوں طرح کی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ طویل مثنویوں میں میرحسؔن کی ''سحرالبیان'' اور دیا شنکرنسیؔم کی ''گلزارِنسیم'' بہت مشہور ہیں۔

مثنوی میں رزم و بزم، حسن وعشق، پند ونصیحت، مدح وہجو، ہر طرح کے موضوعات نظم کیے جاسکتے ہیں۔ قدیم مثنویوں میں زیادہ تر عشقیہ قصّے اور مذہبی واخلاقی مضامین نظم کیے گئے ہیں۔ ان عشقیہ قصّوں میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو نثری داستانوں میں ملتی ہیں۔ فوق فطری عناصر کے علاوہ مثنویوں میں اس زمانے کی تہذیب ومعاشرت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ حاؔلی اور آزاؔد کے زمانے سے مثنویوں کے اسلوب اور موضوعات میں نمایاں فرق آیا ہے۔ اس کے بعد اس میں مختلف موضوعات ومسائل نظم کیے جانے لگے۔

(1738ء – 1786ء)

میر حسنؔ کے خاندان کے لوگ ایران سے آ کر دلّی میں بس گئے تھے۔ اس خاندان نے اردو زبان وادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ میر حسنؔ کے والد میر غلام حسین ضاحکؔ اچھّے شاعر تھے۔ ان کے بیٹے میر خلیقؔ اور ان کے پوتے میر انیسؔ نے اردو شاعری میں مرثیہ گوئی کی نئی راہیں نکالیں۔

میر حسنؔ کچھ دنوں تک میر دردؔ کے شاگرد رہے۔ جب دلّی سے بہت سے لوگوں کا تعلق ٹوٹا تو میر حسنؔ کے والد بھی فیض آباد چلے گئے۔ وہاں سے لکھنؤ پہنچے اور وہیں انتقال کیا۔ میر حسنؔ نے غزلیں بھی لکھی ہیں لیکن ان کی شہرت کا دارومدار اُن کی مثنوی 'سحر البیان' پر ہے۔ یہ مثنوی میر حسنؔ نے انتقال سے کچھ ہی پہلے مکمل کی تھی۔ ''سحر البیان'' کی شہرت اور مقبولیت کے سامنے دوسرے، بہت سے شعرا کی مثنویاں اور خود میر حسنؔ کی دوسری مثنویاں ماند پڑ گئیں۔

منظر نگاری، واقعہ نگاری اور کردار نگاری کو دلچسپ اور متحرّک شکل میں پیش کرنے اور کہانی کو مربوط طریقے سے بیان کرنے میں میر حسنؔ کو خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کی مثنوی مختلف اشیا اور مظاہر کے ذکر سے بھری ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی کی کہانی اگر چہ بالکل خیالی ہے لیکن اس کے واقعات اور کردار جیتے جاگتے اور ہماری دنیا کے باسی معلوم ہوتے ہیں۔

داستان شہزادے کے غائب ہونے کی اور غم سے ماں باپ اور سب کے حالت تباہ کرنے کی

یہاں کا تو قصّہ میں چھوڑا یہاں
ذرا اب سنو غم زدوں کا بیاں

کروں حال ہجراں زدوں کا رقم
کہ گزرا جدائی سے کیا اُن پہ غم

کُھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں
تو دیکھا کہ وہ شاہ زادہ نہیں

نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہ رو
نہ وہ گُل ہے اس جا، نہ وہ اس کی بُو

رہی دیکھ یہ حال حیران کار
کہ یہ کیا ہوا ہائے پروردگار

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی
کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی

کوئی بِلبلاتی سی پھرنے لگی
کوئی ضعف ہو ہو کے گرنے لگی

کوئی سر پہ رکھ ہاتھ، دل گیر ہو
گئی بیٹھ، ماتم کی تصویر ہو

کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی
رہی نرگس، آسا کھڑی کی کھڑی

رہی کوئی اُنگلی کو دانتوں میں داب
کسی نے کہا: گھر ہوا یہ خراب

کسی نے دیے کھول سُنبل سے بال
تپانچوں سے جوں گُل کیے سُرخ گال

نہ بن آئی کچھ ان کو اس کے سوا
کہ کہیے یہ احوال اب شہہ سے جا

سنی شہہ نے القصّہ جب یہ خبر
گرا خاک پر کہہ کے: ہائے پسر!

کلیجہ پکڑ ماں تو بس رہ گئی
کلی کی طرح سے بِکس رہ گئی

کہا شہہ نے : وھاں کا مجھے دو پتا
عزیزو! جہاں سے وہ یوسف گیا

گئے لے وو شہہ کو لبِ بام پر
دکھایا کہ سوتا تھا یھاں سیم بر

یہی تھی جگہ وہ جہاں سے گیا
کہا: ہائے بیٹا ، تو یھاں سے گیا!

مرے نوجواں ! میں کدھر جاؤں پھر
نظر تونے مجھ پر نہ کی بے نظیر!

عجب بحرِ غم میں ڈبویا ہمیں
غرض جان سے تونے کھویا ہمیں

کروں اس قیامت کا کیا میں بیاں
ترقّی میں ہردم تھا شوروفغاں

لبِ بام کثرت جو یک سر ہوئی
تلے کی زمیں ساری، اوپر ہوئی

شب آدھی، وہ جس طرح سوتے کٹی
رہی تھی جو باقی، سو روتے کٹی

میر حسنؔ

مشق

لفظ و معنی

ہجراں زدہ : جدائی کا مارا ہوا
رقم : تحریر (اس کے معنی روپیہ پیسہ کے بھی ہوتے ہیں)
ماہ رو : چاند جیسے چہرے والا
جا : جگہ
ضعف : کمزوری
دل گیر : مغموم، رنجیدہ، غمگین، دل گرفتہ

زنخداں	:	ٹھوڑی
سُنبل	:	ایک قسم کی خوشبودار بیل
پِسر	:	بیٹا
بِکس	:	مُرجھانا
بام	:	بالا خانہ، کوٹھا
سیم بر	:	چاندی جیسے بدن والا
پیر	:	بوڑھا
شور وفغاں	:	بلند آواز سے رونا

غور کرنے کی بات

- میر حسنؔ کی یہ مثنوی تقریباً دوسو سال پرانی ہے۔ اس کی خوبی اس کی سادگی اور جادو بیانی ہے اسی لیے اس کا نام 'سحرالبیان' رکھا گیا ہے۔ اس مثنوی میں ایک ایسے بادشاہ کا ذکر ہے جس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بہت منّتوں مرادوں کے بعد اس کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جو بہت ہی خوب صورت تھا اس لیے اس کا نام بے نظیر رکھا گیا۔ نجومیوں کے کہنے کے مطابق شہزادے کے لیے بارہ سال خطرناک تھے اس لیے اسے کُھلے آسمان کے نیچے نہیں جانا تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بارہ سال پورے ہونے سے چند گھڑیاں پہلے شہزادہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چھت پر جا کر سو گیا اور ایک پری اس کی خوب صورتی کی وجہ سے اس پر عاشق ہوگئی اور اسے اُڑا کر لے گئی۔ آپ کے نصاب میں اس سے آگے کا اقتباس شامل ہے جس میں شہزادے کے غائب ہونے کے بعد محل کے اندر جو آہ وفغاں کا طوفان اٹھا اس کی عکّاسی بہت پراثر انداز میں کی گئی ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. 'ماہ رُو' اور 'گل رُو' کے الفاظ کس کے لیے اور کس شعر میں استعمال ہوئے ہیں؟
2. 'سر پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھنا' اور 'دانتوں میں انگلی دبانا' کے کیا معنی ہیں؟
3. 'تلے کی زمین ساری اوپر ہوئی' اس مصرع کا کیا مطلب ہے؟
4. شہزادے کے غائب ہونے پر کنیزوں نے کس طرح اپنے غم کا اظہار کیا ہے؟ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

عملی کام

- استاد کی مدد سے شعروں کی بلند خوانی کیجیے۔
- نیچے دیے گئے محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔
  کچھ بن نہ آنا، دانتوں میں انگلی دبانا، کھڑی کی کھڑی رہ جانا
- مثنوی کے کس شعر میں کون سی تلمیح استعمال کی گئی ہے، لکھیے۔
- اس مثنوی کے ایسے شعروں کی نشان دہی کیجیے جن میں صنعتِ تشبیہ ہو یہ بھی لکھیے کہ کس چیز کو کس چیز سے تشبیہ دی گئی ہے۔

افسانہ

اردو میں افسانے کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہوا۔ ناول کی طرح اس صنف پر بھی مغربی ادب کا گہرا اثر ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دینے اور مصروف رہنے والوں کے لیے مختصر افسانہ، ناول اور داستان سے زیادہ کشش رکھتا ہے۔

مختلف نقّادوں نے افسانے کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔ ایک نقّاد نے کہا ہے کہ افسانہ ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے۔ ایک اور نقّاد کا قول ہے کہ افسانے میں بنیادی چیز وحدتِ تاثر ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ افسانے کی شکل بھی تبدیل ہوئی ہے۔

ایک اچھّا افسانہ اختصار کے ساتھ زندگی کے کسی گوشے کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مختصر ہونے کی وجہ سے کہانی میں جھول پیدا ہونے کا اندیشہ بھی کم ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کا مشاہدہ اور انسانی نفسیات کا مطالعہ گہرا ہونا چاہیے۔ کردار اور واقعات ایسے ہوں جو ہماری زندگی اور ہمارے تجربوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔

اردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، غلام عباس، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین بہت اہم ہیں۔

پریم چند

(1880ء – 1936ء)

منشی پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ انھوں نے نواب رائے کے نام سے کچھ افسانے لکھے، پھر 1910ء میں پریم چند نام اختیار کیا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ وہ بنارس کے قریب ایک گاؤں لمہی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی عجائب لال ڈاک کے محکمہ میں کلرک تھے۔ پریم چند آٹھ سال کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ جب وہ پندرہ سال کے ہوئے تو ان کے باپ نے ان کی شادی کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں انٹر پاس کرنے کے بعد اپنی تعلیم چھوڑ دینی پڑی۔ انھوں نے محکمۂ تعلیم میں نوکری کر لی۔ سرکاری ملازمت کی وجہ سے حق بات کے اظہار میں رکاوٹ محسوس ہوئی تو ملازمت ترک کر کے ساری زندگی تصنیف و تالیف کے کاموں میں صَرف کر دی۔

پریم چند نے تقریباً ساڑھے تین سو افسانے اور بارہ ناول لکھے۔ انھیں اردو افسانے کا موجد نہیں تو پہلا بڑا افسانہ نگار ضرور کہا جاسکتا ہے اور اکثر لوگوں کے خیال میں وہ اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار بھی ہیں۔ انھوں نے مختصر افسانے کو ایک معیار عطا کیا۔ ان کے افسانے اور ناول اُردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ان کے مجموعوں میں 'واردات'، 'پریم پچّیسی'، 'پریم بتّیسی'، 'آخری تحفہ'، 'نجات' اور 'زادِ راہ' قابل ذکر ہیں اور ان کے ناولوں میں 'چوگانِ ہستی'، 'میدانِ عمل'، 'بیوہ'، 'بازارِ حُسن' اور 'گئودان' ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

پریم چند کے ناول اور افسانے بے مثل حقیقت نگاری کا نمونہ ہیں۔ ان کے افسانوں کا پس منظر مشرقی یوپی کا دیہات ہے۔ ہندوستانی کسان اپنی پوری شخصیت کے ساتھ پریم چند کی تصانیف میں نظر آتا ہے۔ پریم چند کی نثر سادہ اور آسان ہے۔ اپنے اندازِ بیان سے انھوں نے افسانوں کو بہت پُر لطف بنا دیا ہے۔

حجِ اکبر

منشی صابر حسین کی آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ، اپنے بچّہ کے لیے دایہ رکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے، لیکن ایک تو بچّہ کی صحت کی فکر اور دوسرے اپنے برابر والوں سے ہیٹے بن کر رہنے کی ذلّت اس خرچ کو برداشت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ بچّہ دایہ کو بہت چاہتا تھا۔ ہر دم اس کے گلے کا ہار بنا رہتا تھا۔ اس وجہ سے دایہ اور بھی ضروری معلوم ہوتی تھی۔ مگر شاید سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ مروّت کے باعث دایہ کو جواب دینے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ بڑھیا ان کے یہاں تین سال سے نوکر تھی۔ اس نے ان کے اکلوتے بچّے کی پرورش کی تھی۔ اپنا کام دل و جان سے کرتی تھی۔ اسے نکالنے کا کوئی حیلہ نہ تھا اور خواہ مخواہ کیڑے نکالنا صابر جیسے حلیم شخص کے لیے غیر ممکن تھا۔ مگر شاکرہ اس معاملہ میں اپنے شوہر سے متّفق نہ تھی۔ اسے شک تھا کہ دایہ ہم کو لوٹے لیتی ہے۔ جب دایہ بازار سے لوٹتی تو وہ دہلیز میں چھپی رہتی کہ دیکھوں آٹا چھپا کر تو نہیں رکھ دیتی۔ لکڑی تو نہیں چھپا دیتی۔ اس کی لائی ہوئی ہر چیز کو گھنٹوں دیکھتی — بار بار پوچھتی اتنا ہی کیوں؟ کیا بھاؤ ہے؟ کیا اتنا مہنگا ہو گیا؟ دایہ کبھی تو ان بدگمانیوں کا جواب ملائمیت سے دیتی۔ لیکن جب بیگم زیادہ تیز ہو جاتیں تو وہ بھی کڑی پڑ جاتی تھی۔ قسمیں کھاتی۔ صفائی کی شہادتیں پیش کرتی۔ تردید اور حجّت میں گھنٹوں لگ جاتے۔ قریب قریب روزانہ یہی کیفیت رہتی تھی اور روز یہ ڈراما دایہ کی خفیف سی اشک ریزی کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ دایہ کا اتنی سختیاں جھیل کر پڑے رہنا شاکرہ کے شکوک کی آبیاری کرتا تھا۔ اسے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ بُڑھیا محض بچّے کی محبّت سے پڑی ہوئی ہے۔ وہ دایہ کو ایسے لطیف جذبہ کا اہل نہیں سمجھتی تھی۔

اتّفاق سے ایک روز دایہ کو بازار سے لوٹنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہاں دو کنجڑنوں میں بڑے جوش و خروش سے مناظرہ تھا۔ ان کا مصور طرز ادا، ان کا اشتعال انگیز استدلال، ان کی متشکل

تضحیک، ان کی روشن شہادتیں اور منور روایتیں، ان کی تعریض اور تردید بے مثال تھیں۔ زہر کے دو دریا تھے یا دو شعلے جو دونوں طرف سے امڈ کر باہم گتھ گئے تھے۔ کیا روانیٔ زبان تھی! گویا کوزے میں دریا بھرا ہو۔ ان کا جوشِ اظہار ایک دوسرے کے بیانات کو سننے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ان کے الفاظ کی ایسی رنگینی، تخیل کی ایسی نوعیت، اسلوب کی ایسی جدّت، مضامین کی ایسی آمد، تشبیہات کی ایسی موزونیت اور فکر کی ایسی پرواز پر ایسا کون سا شاعر ہے جو رشک نہ کرتا۔ صفت یہ تھی کہ اس مباحثہ میں تلخی یا دلآویزی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ دونوں بُلبلیں اپنے اپنے ترانوں میں محو تھیں۔ ان کی متانت، ان کا ضبط، ان کا اطمینانِ قلب حیرت انگیز تھا۔ ان کے ظرفِ دل میں اس سے کہیں زیادہ کہنے کی اور بدرجہا زیادہ سننے کی گنجائش معلوم ہوتی تھی۔ الغرض یہ خالص دماغی ذہنی مناظرہ تھا۔ اپنے اپنے کمالات کے اظہار کے لیے ایک خالص زور آزمائی تھی اپنے اپنے کرتب اور فن کے جوہر دکھانے کے لیے۔

تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ وہ مبتذل کنایات و اشارے جن پر بے شرمی کو شرم آتی اور کلماتِ رکیک جن سے عفونت بھی دور بھاگتی، ہزاروں رنگین مزاجوں کے لیے محض باعثِ تفریح تھے۔

دایہ بھی کھڑی ہو گئی کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے، پر تماشا اتنا دلآویز تھا کہ اسے وقت کا مطلق احساس نہ ہوا۔ یکا یک نو بجنے کی آواز کان میں آئی تو سحر ٹوٹا۔ وہ لپکی ہوئی گھر کی طرف چلی۔

شاکرہ بھری بیٹھی تھی۔ دایہ کو دیکھتے ہی تیور بدل کر بولی — ''کیا بازار میں کھو گئی تھیں؟ دایہ نے خطاوارانہ انداز سے سر جُھکا لیا اور بولی ''بیوی ایک جان پہچان کی ماما سے ملاقات ہو گئی اور باتیں کرنے لگی۔''

شاکرہ جواب سے اور بھی برہم ہوئی۔ یہاں دفتر جانے کو دیر ہو رہی ہے تمھیں سیر سپاٹے کی سوجھی ہے۔ مگر دایہ نے اس وقت دبنے میں خیریت سمجھی۔ بچّہ کو گود میں لینے چلی۔ پر شاکرہ نے جھڑک کر کہا۔ ''رہنے دو۔ تمھارے بغیر بے حال نہیں ہوا جاتا۔''

دایہ نے اس حکم کی تعمیل ضروری نہ سمجھی بیگم صاحبہ کا غصّہ فرو کرنے کی اس سے زیادہ کارگر

کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی۔اس نے نصیر کواشارے سے اپنی طرف بلایا۔وہ دونوں ہاتھ پھیلائے لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف چلا۔دایہ نے اسے گود میں اٹھالیا۔اور دروازہ کی طرف چلی لیکن شاکرہ باز کی طرح جھپٹی اور نصیر کو اس کی گود سے چھین کر بولی۔''تمہارا یہ مکر بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔یہ تماشے کسی اور کو دکھایئے۔یہاں طبیعت سیر ہوگئی۔''

دایہ نصیر پر جان دیتی تھی اور سمجھتی تھی کہ شاکرہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔اس کی سمجھ میں شاکرہ اور اس کے درمیان یہ ایسا مضبوط تعلق تھا جسے معمولی ترشیاں کمزور نہ کرسکتی تھیں۔اسی وجہ سے باوجود شاکرہ کی سخت زبانیوں کے اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ واقعی مجھے نکالنے پر آمادہ ہے۔پر شاکرہ نے یہ باتیں کچھ اس بے رخی سے کیں اور بالخصوص نصیر کو اس بے دردی سے چھین لیا کہ دایہ سے ضبط نہ ہوسکا۔بولی۔''بیوی مجھ سے کوئی ایسی بڑی خطا تو نہیں ہوئی۔بہت ہوگا تو پاؤ گھنٹہ کی دیر ہوئی ہوگی۔اس پر آپ اتنا جھلا رہی ہیں۔صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ دوسرا دروازہ دیکھو۔اللہ نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی دے گا۔مزدوری کا کال تھوڑا ہی ہے۔''

شاکرہ:''تو یہاں تمھاری کون پروا کرتا ہے۔تمھاری جیسی ماما ئیں گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔''

دایہ:''ہاں خدا آپ کو سلامت رکھے۔ماما ئیں،دائیاں بہت ملیں گی۔جو کچھ خطا ہوئی ہو۔معاف کیجیے گا۔میں جاتی ہوں۔''

شاکرہ:''جا کر مردانے میں اپنی تنخواہ کا حساب کرلو۔''

دایہ:''میری طرف سے نصیر میاں کو اس کی مٹھائیاں منگوا دیجیے گا۔''

اتنے میں صابر حسین بھی باہر سے آگئے۔پوچھا۔''کیا ہے؟''

دایہ:''کچھ نہیں۔بیوی نے جواب دے دیا ہے۔گھر جاتی ہوں۔''

صابر حسین خانگی تردّدات سے یوں بچتے تھے جیسے کوئی برہنہ پا کانٹوں سے بچے۔انھیں سارے دن ایک ہی جگہ کھڑے رہنا منظور تھا۔پر کانٹوں میں پیر رکھنے کی جرأت نہ تھی۔چیں بہ جبیں ہوکر بولے۔''کیا بات ہوئی؟''

شاکرہ: '' کچھ نہیں۔ اپنی طبیعت۔ نہیں جی چاہتا نہیں رکھتے۔ کسی کے ہاتھوں بِک تو نہیں گئے۔''

صابر: ''تمھیں بیٹھے بٹھائے ایک نہ ایک کھچڑ سوجھتی رہتی ہے۔''

شاکرہ: ''ہاں مجھے تو اس بات کا جنون ہے۔ کیا کروں؟ خصلت ہی ایسی ہے۔ تمھیں یہ بہت پیاری ہے۔ تو لیجا کر گلے باندھو! میرے یہاں ضرورت نہیں ہے۔''

دایہ گھر سے نکلی تو اس کی آنکھیں لبریز تھیں۔ دل نصیر کے لیے تڑپ رہا تھا کہ ایک بار بچّے کو گود میں لے کر پیار کرلوں۔ پر یہ حسرت لیے اسے گھر سے نکلنا پڑا۔

نصیر دایہ کے پیچھے پیچھے دروازہ تک آیا لیکن جب دایہ نے دروازہ باہر سے بند کردیا تو مچل کر زمین پر لیٹ گیا۔ اور انّا انّا کہہ کر رونے لگا۔ شاکرہ نے چمکارا پیار کیا۔ گود میں لینے کی کوشش کی۔ مٹھائی کا لالچ دیا۔ میلہ دکھانے کا وعدہ کیا۔ اس سے کام نہ چلا تو بندر اور سپاہی اور لُولُو اور ہوّا کی دھمکی دی۔ مگر نصیر پر مطلق اثر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ شاکرہ کو غصّہ آ گیا۔ اس نے بچّہ کو وہیں چھوڑ دیا۔ اور آ کر گھر کے دھندوں میں مصروف ہوگئی۔ نصیر کا منھ اور گال لال ہو گئے۔ آنکھیں سوج گئیں۔ آخر وہ وہیں زمین پر سسکتے سسکتے سو گیا۔

شاکرہ نے سمجھا تھا تھوڑی دیر میں بچّہ رو دھو کر چُپ ہو جائے گا۔ پر نصیر نے جاگتے ہی پھر انّا کی رٹ لگائی۔ تین بجے صابر حسین دفتر سے آئے اور بچّے کی یہ حالت دیکھی تو بیوی کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر اسے گود میں اٹھالیا۔ اور بہلانے لگے۔ آخر نصیر کو جب یقین ہو گیا کہ دایہ مٹھائی لینے گئی تو اسے تسکین ہوئی۔ مگر شام ہوتے ہی اس نے پھر چیخنا شروع کیا۔ '' انّا مٹھائی لائی؟''

اس طرح دو تین دن گزر گئے۔ نصیر کو انّا کی رٹ لگانے اور رونے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ وہ بے ضرر کُتّا جو ایک لمحہ کے لیے اس کی گود سے جدا نہ ہوتا تھا۔ وہ بے زبان بلّی جسے طاق پر بیٹھے دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ طائرِ بے پرواز جس پر وہ جان دیتا تھا۔ سب اس کی نظروں

سے گر گئے۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ انّا جیسی جیتی جاگتی پیار کرنے والی، گود میں لے کر گھمانے والی، تھپک تھپک کر سلانے والی، گا گا کر خوش کرنے والی چیز کی جگہ ان بے جان، بے زبان چیزوں سے پُر نہ ہوسکتی تھی۔ وہ اکثر سوتے سوتے چونک پڑتا اور انّا انّا پکار کے رونے لگتا۔ کبھی دروازہ پر جاتا اور انّا انّا پکار کر ہاتھوں سے اشارہ کرتا۔ گویا اسے بلا رہا ہے۔ انّا کی خالی کوٹھری میں جا کر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اسے امّید ہوتی تھی کہ انّا یہاں آتی ہوگی۔ اس کوٹھری کا دروازہ بند پاتا تو جا کر کواڑ کھٹکھٹاتا کہ شاید انّا اندر چھپی بیٹھی ہو۔ صدر دروازہ کھُلتے سنتا تو انّا انّا کہہ کر دوڑتا۔ سمجھتا کہ انّا آ گئی۔ اس کا گدرایا ہوا بدن گھُل گیا۔ گلاب کے سے رخسار سوکھ گئے۔ ماں اور باپ دونوں اس کی موہنی ہنسی کے لیے ترس ترس کر رہ جاتے۔ اگر بہت گدگدانے اور چھیڑنے سے ہنستا بھی تو ایسا معلوم ہوتا دل سے نہیں محض دل رکھنے کے لیے ہنس رہا ہے۔ اسے اب دودھ سے رغبت تھی نہ مصری سے، نہ میوہ سے، نہ میٹھے بسکٹ سے، نہ تازی امرتیوں سے۔ ان میں مزہ تھا جب انّا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھی۔ اب ان میں مزہ نہ تھا۔ دو سال کا ہونہار لہلہاتا ہوا شاداب پودا مرجھا کر رہ گیا۔ وہ لڑکا جسے گود میں اٹھاتے ہی نرمی، گرمی اور وزن کا احساس ہوتا تھا۔ اب استخوان کا ایک پُتلا رہ گیا تھا۔ شاکرہ بچّہ کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی اور اپنی حماقت پر پچھتاتی۔ صابر حسین جو فطرتاً خلوت پسند آدمی تھے۔ اب نصیر کو گود سے جدا نہ کرتے تھے۔ اسے روز ہوا کھلانے جاتے، نت نئے کھلونے لاتے۔ پر مرجھایا ہوا پودا کسی طرح نہ پنپتا تھا۔ دایہ اس کی دنیا کا آفتاب تھی۔ اس قدرتی حرارت اور روشنی سے محروم ہو کر سبزہ کی بہار کیوں کر دکھاتا؟ دایہ کے بغیر اسے چاروں طرف اندھیرا، سنّاٹا نظر آتا تھا۔ دوسری انا تیسرے ہی دن رکھ لی تھی۔ پر نصیر اس کی صورت دیکھتے ہی منہ چھپا لیتا تھا۔ گویا وہ کوئی دیونی یا بھُتنی ہے۔

عالمِ وجود میں دایہ کو نہ دیکھ کر نصیر اب زیادہ تر عالمِ خیال میں رہتا۔ وہاں اس کی اپنی انّا چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ اس کی وہی گود تھی۔ وہی محبت، وہی پیاری باتیں، وہی پیارے پیارے گیت، وہی مزے دار مٹھائیاں، وہی سہانا سنسار، وہی دلکش لیل ونہار، اکیلے بیٹھے انّا سے باتیں

کرتا۔ انّا کتا بھونکے۔ انّا گائے دودھ دیتی۔ انّا جلا اجلا گھوڑا دوڑتا۔ سویرا ہوتے ہی لوٹا لے کر دایہ کی کوٹھری میں جاتا اور کہتا۔ ''انّا پانی پی'' دودھ کا گلاس لے کر اس کی کوٹھری میں رکھ آتا اور کہتا۔ ''انّا دودھ پلا—'' اپنی چارپائی پر تکیہ رکھ کر چادر سے ڈھانک دیتا اور کہتا۔ ''انّا سوتی'' شاکرہ کھانے بیٹھتی تو رکابیاں اٹھا اٹھا انّا کی کوٹھری میں لے جاتا اور کہتا ''انّا کھانا کھائے گی'' انّا اس کے لیے اب ایک آسمانی وجود تھی جس کی واپسی کی اسے مطلق امید نہ تھی۔ وہ محض گزشتہ خوشیوں کی دلکش یادگار تھی جس کی یاد ہی اس کا سب کچھ تھی۔ نصیر کے انداز میں رفتہ رفتہ طفلانہ شوخی اور بیتابی کی جگہ ایک حسرت ناک توکّل، ایک مایوسانہ خوشی نظر آنے لگی۔ اس طرح تین ہفتے گزر گئے۔ برسات کا موسم تھا۔ کبھی شدت کی گرمی، کبھی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے، بخار اور زکام کا زور تھا۔ نصیر کی نقاہت اس موسمی تغیّرات کو برداشت نہ کرسکی۔ شاکرہ احتیاطاً اسے فلالین کا کرتا پہنائے رکھتی۔ اسے پانی کے قریب نہ جانے دیتی۔ ننگے پاؤں ایک قدم نہ چلنے دیتی۔ مگر رطوبت کا اثر ہو ہی گیا۔ نصیر کھانسی اور بخار میں مبتلا ہو گیا۔

صبح کا وقت تھا۔ نصیر چارپائی پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کا علاج بے سود ہو رہا تھا۔ شاکرہ چارپائی پر بیٹھی اس کے سینے پر تیل کی مالش کر رہی تھی اور صابر حسین صورتِ غم بنے ہوئے بچّہ کو پُر درد نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس طرف وہ شاکرہ سے بہت کم بولتے تھے۔ انھیں اس سے ایک نفرت سی ہوگئی تھی۔ وہ نصیر کی اس بیماری کا سارا الزام اسی کے سر رکھتے تھے۔ وہ ان کی نگاہوں میں نہایت کم ظرف، سفلہ مزاج، بے حس عورت تھی۔

شاکرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ '' آج بڑے حکیم صاحب کو بُلا لیتے۔ شاید انھیں کی دوا سے فائدہ ہو'' صابر حسین نے کالی گھٹاؤں کی طرف دیکھ کر تُرشی سے جواب دیا۔

''بڑے حکیم نہیں۔ لقمان بھی آئیں تو اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔''

شاکرہ: ''تو کیا اب کسی کی دوا ہی نہ ہوگی؟''

صابر: ''بس اس کی ایک ہی دوا ہے اور وہ نایاب ہے۔''

شاکرہ: ''تمھیں تو وہی دُھن سوار ہے۔ کیا عبّاسی امرت پلا دے گی؟''

صابر: ''ہاں وہ تمھارے لیے چاہے زہر ہو۔ لیکن بچّے کے لیے امرت ہی ہو گی۔''

شاکرہ: ''میں نہیں سمجھتی کہ اللہ کی مرضی میں اسے اتنا دخل ہے۔''

صابر: ''اگر نہیں سمجھتی ہو اور اب تک نہیں سمجھا تو روؤ گی۔ بچّے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔''

شاکرہ: ''چپ بھی رہو۔ کیسا شگون زبان سے نکالتے ہو اگر ایسی جلی کٹی سنانی ہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔''

صابر: ''ہاں تو میں جاتا ہوں۔ مگر یاد رکھو یہ خون تمھاری گردن پر ہوگا۔ اگر لڑکے کو پھر تندرست دیکھنا چاہتی ہو تو اس عبّاسی کے پاس جاؤ۔ اس کی منّت کرو۔ التجا کرو۔ تمھارے بچّے کی جان اسی کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔''

شاکرہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

صابر حسین نے پوچھا۔ ''کیا مرضی ہے۔ جاؤں، اسے تلاش کروں؟''

شاکرہ: ''تم کیوں جاؤ گے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔''

صابر: ''نہیں معاف کرو۔ مجھے تمھارے اوپر اعتبار نہیں ہے۔ نہ جانے تمھارے منھ سے کیا نکل جائے کہ وہ آتی بھی ہو تو نہ آئے۔''

شاکرہ نے شوہر کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھ کر کہا۔ ''ہاں اور کیا! مجھے اپنے بچّے کی بیماری کا قلق تھوڑے ہی ہے۔ میں نے شرم کے مارے تم سے کہا نہیں لیکن میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ اگر مجھے دایہ کے مکان کا پتہ معلوم ہوتا تو میں اسے کب کی منا لائی ہوتی۔ وہ مجھ سے کتنی ہی ناراض ہو لیکن نصیر سے اسے محبّت تھی۔ میں آج ہی اس کے پاس جاؤں گی۔ اس کے قدموں کو آنسوؤں سے تر کر دوں گی۔ اور وہ جس طرح راضی ہوگی اسے راضی کروں گی۔''

شاکرہ نے بہت ضبط کر کے یہ باتیں کہیں۔ مگر اُمڈے ہوئے آنسو اب نہ رک سکے۔

صابر حسین نے بیوی کی طرف ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا اور نادم ہوکر بولے۔" میں تمھارا جانا مناسب نہیں سمجھتا، خود ہی جاتا ہوں۔"

عبّاسی دنیا میں اکیلی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا خاندان گلاب کا سرسبز شاداب درخت تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خزاں نے سب پتّیاں گرادیں۔ بادِحوادث نے درخت کو پامال کردیا۔ اور اب یہی سوکھی ٹہنی ہرے بھرے درخت کی یادگار باقی تھی۔

مگر نصیر کو پاکر اس کی سوکھی ٹہنی میں جان سی پڑ گئی تھی۔ اس میں ہری ہری پتّیاں نکل آئی تھیں۔ وہ زندگی جواب تک خشک اور پامال تھی۔ اس میں پھر رنگ و بو کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ اندھیرے بیاباں میں بھٹکے ہوئے مسافر کو شمع کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اب اس کا جوئے حیات سنگ ریزوں سے نہ ٹکراتا تھا۔ وہ اب ایک گلزار کی آبیاری کرتا تھا۔ اب اس کی زندگی مہمل نہیں تھی۔ اس میں معنی پیدا ہوگئے تھے۔

عبّاسی نصیر کی بھولی بھولی باتوں پر نثار ہوگئی۔ مگر وہ اپنی محبّت کو شاکرہ سے چُھپاتی تھی۔ اس لیے کہ ماں کے دل میں رشک نہ ہو۔ وہ نصیر کے لیے ماں سے چُھپ کر مٹھائیاں لاتی اور اسے کِھلا کر خوش ہوتی۔ وہ دن میں دو دو تین تین بار اسے ابٹن ملتی کہ بچّہ خوب پروان چڑھے۔ وہ اسے دوسروں کے سامنے کوئی چیز نہ کھلاتی کہ بچّے کو نظر نہ لگ جائے۔ ہمیشہ دوسروں سے بچّے کی کم خوری کا رونا رویا کرتی۔ اسے نظر بد سے بچانے کے لیے تعویذ اور گنڈے لاتی رہتی۔ یہ اس کی خالص مادرانہ محبّت تھی۔ جس میں اپنے روحانی احتظاظ کے سوا اور کوئی غرض نہ تھی۔

اس گھر سے نکل کر آج عبّاسی کی وہ حالت ہوگئی جو تھیٹر میں یکا یک بجلیوں کے گل ہوجانے سے ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی صورت ناچ رہی تھی۔ کانوں میں وہی پیاری پیاری باتیں گونج رہی تھیں، اسے اپنا گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ اس کال کوٹھری میں دم گھٹا جاتا تھا۔

رات جوں توں کر کے کٹی۔ صبح کو وہ مکان میں جھاڑو دے رہی تھی۔ یکا یک تازے حلوے کی صدا سن کر بے اختیار باہر نکل آئی۔ معاً یاد آ گیا۔ آج حلوہ کون کھائے گا؟ آج گود میں بیٹھ کر

کون چہکے گا۔ وہ نغمۂ مسرت سُننے کے لیے، جوحلوہ کھاتے وقت نصیر کی آنکھوں سے، ہونٹوں سے، اور جسم کے ایک ایک عضو سے برستا تھا،عبّاسی کی روح تڑپ اٹھی۔ وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلی کہ چلوں۔نصیر کو دیکھ آؤں، پر آدھے راستہ سے لوٹ گئی۔

نصیر عبّاسی کے دھیان سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں اترتا تھا۔ وہ سوتے سوتے چونک پڑتی۔ معلوم ہوتا نصیر ڈنڈے کا گھوڑا دبائے چلا آتا ہے۔ پڑوسنوں کے پاس جاتی تو نصیر ہی کا چرچا کرتی۔ اس کے گھر کوئی آتا تو نصیر ہی کا ذکر کرتی۔نصیر اس کے دل اور جان میں بسا ہوا تھا۔شاکرہ کی بے رخی اور بدسلوکی کے ملال کے لیے اس میں جگہ نہ تھی۔

وہ روز ارادہ کرتی کہ آج نصیر کو دیکھنے جاؤں گی۔ اس لیے بازار سے کھلونے اور مٹھائیاں لاتی۔گھر سے چلتی۔لیکن کبھی آدھے راستے سے لوٹ آتی۔کبھی دو چار قدم سے آگے نہ بڑھا جاتا۔ کون منھ لے کر جاؤں؟ جو محبّت کو فریب سمجھتا ہو اسے کون منھ دکھاؤں! کبھی سوچتی، کہیں نصیر مجھے نہ پہچانے تو! بچّوں کی محبّت کا اعتبار کیا؟ نئی دایہ سے رچ گیا ہو۔ یہ خیال اس کے پیروں میں زنجیر کا کام کر جاتا تھا۔

اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔عبّاسی کا دل ہر دم اچاٹ رہتا۔ جیسے اسے کوئی لمبا سفر درپیش ہو۔گھر کی چیزیں جہاں کی تہاں پڑی رہتیں۔ نہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی۔ بدنی ضروریات بھی خلاءِ دل کو پُر کرنے میں لگی ہوتی تھیں۔ اتفاق سے اسی اثنا میں حج کے دن آ گئے۔ محلّے میں کچھ لوگ حج کی تیاریاں کرنے لگے۔عبّاسی کی حالت اس وقت پالتو چڑیا کی سی تھی۔ جو قفس سے نکل کر پھر کسی گوشہ کی تلاش میں ہو۔ اسے اپنے تئیں بھلا دینے کا یہ ایک بہانہ مل گیا۔ وہ آمادۂ سفر ہو گئی۔

آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی تھیں۔ دہلی اسٹیشن پر زائرین کا ہجوم تھا۔ کچھ گاڑیوں میں بیٹھے تھے۔ کچھ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ چاروں طرف اک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ دنیا اس وقت بھی جانے والوں کے دامن پکڑے ہوئے تھی۔ کوئی بیوی سے تاکید کر رہا تھا۔'' دھان کٹ جائے تو تالاب والے کھیت میں مٹر بو دینا اور

باغ کے پاس گیہوں۔'' کوئی اپنے جوان لڑکے کو سمجھا رہا تھا۔'' آسامیوں پر بقایا لگان کی نالش کرنے میں دیر نہ کرنا اور دو روپیہ سیکڑہ سود ضرور مجرا کر لینا—'' ایک بوڑھے تاجر صاحب اپنے منیم سے کہہ رہے تھے۔'' مال آنے میں دیر ہو تو خود چلے جایئے گا اور چلتو مال لیجیے گا ورنہ روپیہ پھنس جائے گا۔'' مگر خال خال ایسی صورتیں بھی نظر آتی تھیں جن پر مذہبی ارادت کا جلوہ تھا۔ وہ یا تو خاموش آسمان کی طرف تاکتی تھیں، یا محوِ تسبیح خوانی تھیں۔عبّاسی بھی ایک گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ان بھلے آدمیوں کو اب بھی دنیا کی فکر نہیں چھوڑتی۔ وہی خرید و فروخت لین دین کے چرچے! نصیر اس وقت یہاں ہوتا تو بہت روتا۔ میری گود سے کسی طرح نہ اُترتا۔لوٹ کر ضرور اسے دیکھنے جاؤں گی—یا اللہ! کسی طرح گاڑی چلے۔گرمی کے مارے کلیجہ بھُنا جاتا ہے۔اتنی گھٹا امڈی ہوئی ہے۔برسنے کا نام ہی نہیں لیتی۔معلوم نہیں یہ ریل والے کیوں دیر کر رہے ہیں؟ جھوٹ موٹ اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جھٹ پٹ گاڑی کھول دیں۔مسافروں کی جان میں جان آئے۔یکا یک اس نے صابر حسین کو بائیسکل لیے پلیٹ فارم پر آتے دیکھا۔ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور کپڑے تر تھے۔ وہ گاڑیوں میں جھانکنے لگے۔عبّاسی محض یہ دکھانے کے لیے کہ میں بھی حج کرنے جارہی ہوں، گاڑی سے باہر نکل آئی۔صابر حسین اسے دیکھتے ہی لپک کر قریب آئے اور بولے —'' کیوں عبّاسی! تم بھی حج کو چلیں؟''

عبّاسی نے فخریہ انکسار سے کہا۔'' ہاں! یہاں کیا کروں؟ زندگی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں۔خدا کے یہاں منھ دکھانے کے لیے بھی تو کوئی سامان چاہیے۔ نصیر میاں تو اچھّی طرح ہیں؟''

صابر:'' اب تو تم جارہی ہو۔نصیر کا حال پوچھ کر کیا کروگی۔اس کے لیے دعا کرتی رہنا۔''

عبّاسی کا سینہ دھڑکنے لگا۔گھبرا کر بولی۔'' کیا دشمنوں کی طبیعت اچھّی نہیں ہے؟

صابر:'' اس کی طبیعت تو اسی دن سے خراب ہے جس دن تم وہاں سے نکلیں۔کوئی دو ہفتہ تک تو انّا انّا کی رٹ لگاتا رہا۔اور اب ایک ہفتہ سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے۔ساری

دوائیں کر کے ہار گیا۔ کوئی نفع ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ارادہ کیا تھا چل کر تمھاری منّت سماجت کر کے لے چلوں۔ کیا جانے! تمھیں دیکھ کر اس کی طبیعت کچھ سنبھل جائے لیکن تمھارے گھر پر آیا تو معلوم ہوا کہ تم حج کرنے جا رہی ہو۔ اب کس منھ سے چلنے کو کہوں۔ تمھارے ساتھ سلوک ہی کون سا اچھّا کیا تھا؟ کہ اتنی جرأت کر سکوں اور پھر کارِ ثواب میں رخنہ ڈالنے کا بھی خیال ہے۔ جاؤ! اس کا خدا حافظ ہے۔ حیات باقی ہے تو صحت ہو ہی جائے گی ورنہ مشیتِ ایزدی سے کیا چارہ؟''

عبّاسی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا۔ دل سے دعا نکلی — ''اللہ میری جان کے صدقے، میرے نصیر کا بال بیکا نہ ہو۔'' رقّت سے گلا بھر آیا — ''میں کیسی سنگ دل ہوں پیارا بچّہ رو رو کر ہلکان ہو گیا اور میں اسے دیکھنے تک نہ گئی۔ شاکرہ بدمزاج سہی، بدزبان سہی، نصیر نے میرا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے ماں کا بدلہ نصیر سے لیا۔ یا خدا میرا گناہ بخشیو! پیارا نصیر میرے لیے ہڑک رہا ہے (اس خیال سے عبّاسی کا کلیجہ مسوس اٹھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے) مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے مجھ سے اتنی محبّت ہے۔ ورنہ شاکرہ کی جوتیاں کھاتی اور گھر سے قدم نہ نکالتی آہ! نہ معلوم! بچارے کی کیا حالت ہے؟ انداز وحشت سے بولی۔ ''دودھ تو پیتے ہیں نا؟''

صابر: ''تم دودھ پینے کو کہتی ہو۔ اس نے دو دن سے آنکھیں تو کھولی نہیں۔''

عبّاسی: ''یا میرے اللہ! ارے اوقلی! قلی! بیٹا! آ کے میرا اسباب گاڑی سے اتار دے۔ اب مجھے حج وج کی نہیں سوجھتی۔ ہاں بیٹا! جلدی کر۔ میاں! دیکھیے کوئی یکّہ ہو تو ٹھیک کر لیجیے—''

یکّہ روانہ ہوا۔ سامنے سڑک پر کئی بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ عبّاسی بار بار جھنجھلاتی تھی اور یکّہ بان سے کہتی تھی۔ ''بیٹا! جلدی کر میں تجھے کچھ زیادہ دے دوں گی۔'' راستہ میں مسافروں کی بھیڑ دیکھ کر اسے غصّہ آتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا گھوڑے کے پر لگ

جاتے۔لیکن جب صابر حسین کا مکان قریب آ گیا تو عبّاسی کا سینہ زور سے اُچھلنے لگا۔سر تیورا گیا۔ بار بار دل سے دعا نکلنے لگی۔خدا کرے سب خیر وعافیت ہو۔

یکّہ صابر حسین کی گلی میں داخل ہوا۔دفعتاً عبّاسی کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس کا کلیجہ منھ کو آ گیا۔سر تیورا گیا۔معلوم ہوا دریا میں ڈوبی جاتی ہو۔جی چاہا یکہ سے کود پڑوں۔مگر ذرا دیر میں معلوم ہوا کہ عورت میکے سے وِداع ہو رہی ہے۔تسکین ہوئی۔

آخر صابر حسین کا مکان آ پہنچا۔عبّاسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تاکا۔جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا یتیم لڑکا شام کو بھوکا پیاسا گھر آئے اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے۔دروازہ پر سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔باورچی بیٹھا حقّہ پی رہا تھا۔عبّاسی کو ذرا ڈھارس ہوئی۔گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ نئی دایہ بیٹھی پولٹس پکا رہی ہے۔کلیجہ مضبوط ہوا۔ شاکرہ کے کمرے میں گئی تو اس کا دل گرما کی دوپہری دھوپ کی طرح کانپ رہا تھا۔شاکرہ نصیر کو گود میں لیے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی۔غم اور یاس کی زندہ تصویر۔

عبّاسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پوچھا۔نصیر کو اس کی گود سے لے لیا اور اس کے منھ کی طرف چشمِ پُرنم سے دیکھ کر کہا۔''بیٹا! نصیر! آنکھیں کھولو۔''

نصیر نے آنکھیں کھولیں۔ایک لمحہ تک دایہ کو خاموش دیکھتا رہا۔تب یکایک دایہ کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا— ''انّا آئی۔انّا آئی۔''

نصیر کا زرد مُرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جائے۔ایسا معلوم ہوا گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔صبح کا وقت تھا۔نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا۔صابر حسین نے آکر اسے گود میں اٹھا لیا اور پیار کر کے بولے۔''تمھاری انّا کو مار کر بھگا دیں؟ نصیر نے منھ بنا کر کہا۔''نہیں روئے گی۔''

عبّاسی بولی ''کیوں بیٹا! مجھے تو تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا۔ میرے حج کا ثواب کون دے گا؟''

صابر حسین نے مسکرا کر کہا— ''تمھیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہوگیا۔ اس حج کا نام حجِ اکبر ہے۔''

منشی پریم چند

مشق

لفظ و معنی

حلیم	:	برداشت کرنے والا، نیک مزاج کا، رحم کرنے والا
تردید	:	کسی چیز یا کسی بات کو غلط ٹھہرانا
اشک ریزی	:	آنسو بہانا
مناظرہ	:	بحث، مباحثہ
اشتعال	:	غصّہ، بھڑک اٹھنا
تضحیک	:	ہنسی اڑانا
تعریض	:	اعتراض کرنا
رکیک	:	بہت باریک، کم قیمت، چھچھورا
عفونت	:	بدبو، بساند
بےضرر	:	جس سے کوئی نقصان نہ ہو
استخوان	:	ہڈّی

لیل	:	رات
نہار	:	دن
رطوبت	:	نمی، تری
قلق	:	افسوس
سنگریزہ	:	کنکری
زائر	:	زیارت کرنے والا
مشیتِ ایزدی	:	اللہ کی مرضی
کوزہ	:	مٹی کا پیالا
شائبہ	:	ہلکا سا نشان، لہٰذا ہلکا سا شبہ یا شک
خطاوارانہ	:	قصور کرنے والے کی طرح
احتظاظ	:	لطف اٹھانا، مزہ لینا

غور کرنے کی بات

- اس افسانے میں منشی پریم چند نے متوسط طبقے کے مسلم گھرانے کی روزمرہ زندگی کی عکاسی کی ہے۔
- افسانے کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف نے عورت کی 'ممتا' کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔
- افسانے میں عورتوں اور بچّوں کی نفسیات کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔
- مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ صرف مذہبی فرائض ادا کرنے سے ہی ثواب نہیں ملتا بلکہ انسانی حقوق کی ادائیگی بھی عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔
- اس افسانے میں پریم چند نے خدمتِ خلق کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ جس کا درجہ اور ثواب بعض حالات میں عبادت سے بھی بڑھ کر ہو جاتا ہے۔

- یہ افسانہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ غریب اور مجبور لوگوں کو کمتر نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ انسانی زندگی کا ایک اہم اور ضروری حصّہ ہوتے ہیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. شاکرہ عبّاسی سے کیوں ناراض رہتی تھی؟
2. نصیر کی بیماری کا کیا سبب تھا؟
3. عبّاسی نے حج پر جانا کیوں ملتوی کر دیا تھا؟
4. عبّاسی کی واپسی سے نصیر پر کیا اثر ہوا؟
5. صابر حسین نے عبّاسی سے یہ کیوں کہا:
"تمھیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہوگیا۔ اس حج کا نام حجِ اکبر ہے۔"

عملی کام

- افسانے کو غور سے پڑھیے۔
- ذیل میں دیے گئے محاوروں کے جملے بنائیے:
- خوشی سے پھولا نہ سمانا، آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا، کانٹوں میں پیر رکھنا، گلے کا ہار ہونا، طبیعت سیر ہونا
- افسانے کا مرکزی خیال بتائیے۔
- درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے:

نفرت، سستا، ہوش، محبت، مہنگا، خوش، رونا، شیریں، ہنسی

- اس افسانے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

صالحہ عابد حسین

(1913ء – 1988ء)

صالحہ عابد حسین کا اصلی نام مصداق فاطمہ تھا۔ وہ خواجہ غلام الثّقلین کی صاحبزادی اور ڈاکٹر سیّد عابد حسین کی بیوی تھیں۔ وہ خواجہ الطاف حسین حالؔی کے خاندان میں پانی پت میں پیدا ہوئیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق انھیں بچپن ہی سے تھا، مشہور مصنف، فلسفی اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر عابد حسین سے شادی کے بعد ان کے تصنیف و تالیف کے شوق میں مزید اضافہ ہوا۔ لیکن ان کی بنیادی حیثیت ناول نویس اور افسانہ نگار کی ہے۔ صالحہ عابد حسین اپنے قلم کے ذریعے تحریکِ آزادی میں شریک رہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کے ذریعے انسانی اور تہذیبی قدروں کو عام کیا اور عورتوں کے مسائل اور سماجی خرابیوں کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔ حکومتِ ہند نے ان کو 'پدم شری' کا اعزاز عطا کیا۔ کئی صوبائی اکادمیوں نے بھی انھیں انعام دیے۔ ان کے ناولوں میں 'عذرا'، 'آتشِ خاموش'، 'قطرے سے گہر ہونے تک'، 'یادوں کے چراغ' اور 'اپنی اپنی صلیب' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ افسانوں کے چار مجموعے بھی شائع ہوئے۔

مگر وہ ٹوٹ گئی

دور کسی گھنٹے نے دو بجائے۔ اس کے وسیع بیڈ روم کے ہاتھی دانت کے لیمپ میں نیلا زیرو بلب روشن تھا جس کی ٹھنڈی روشنی میں ہر چیز بے جان سی نظر آ رہی تھی۔ سنگھار میز پر سجی سیکڑوں شیشیاں، بوتلیں برش وغیرہ وغیرہ — ڈبل بیڈ کا قیمتی بستر اور نیلا نائٹ گون، چھت پر لٹکا چھوٹا سا بلوریں جھاڑ — ہر چیز اس کا منھ چڑا رہی تھی۔

برابر کے کمرے میں بچّے اپنی آیا کے ساتھ آرام کر رہے تھے۔ دوسرے نوکر اپنے اپنے کواٹرز میں محوِ خواب ہوں گے — ہاں صرف اس کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ دو بج چکے، نہ وہ آئے، نہ نیند آئی۔ جس طرح وہ روٹھے روٹھے ہیں اسی طرح نیند بھی روٹھ گئی ہے۔ وہ ڈبل بیڈ کے دوسرے حصّے پر لوٹ لگا کر آ گئی اور ان کے تکیے پر سر رکھ دیا آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب سا امنڈ آیا جو اس کے گالوں پر لڑھکتے، کنپٹیوں پر سے پھسلتے نرم تکیے میں جذب ہوتے رہے۔ سامنے دیوار پر ان دونوں کی قد آدم رنگین تصویر آویزاں تھی۔ ان کی شادی کی تصویر۔ اس کے چہرے پر شرمیلی اور مسرور مسکراہٹ ہے اور ان کی آنکھوں میں اشتیاق ہے، شرارت ہے اور تجسّس بھی!

شادی — شادی — شادی!!

شادی یا بربادی؟ کتنی بربادیاں اس نے اپنے چاروں طرف دیکھی تھیں۔ امّاں کی زندگی — بھابھی کا انجام، اس کی پیاری سہیلی منورما کی خودکشی، اس کی ٹیچر کی تنہا اداس زندگی۔ دو چار نہیں بیسیوں ناکام شادیوں کو اس نے دیکھا تھا۔ یہ شادی بربادی کیوں بن جاتی ہے؟ عورتیں تو مردوں ہی کو الزام دیتی ہیں مگر کیا ان کا قصور کچھ نہیں ہوتا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ شادی شدہ زندگی کو کامیاب اور

مسرور بنانا عورت کا کام ہے۔ نباہنے کی ذمے داری مرد سے زیادہ عورت پر آتی ہے۔ اگر وہ چاہے تو۔ اگر وہ چاہے تو؟ کیا نباہ نہیں ہوسکتا۔ اس نے اگر کبھی شادی کی تو— ''نہیں نہیں—'' وہ لرز اٹھتی۔ جانے کیا انجام ہو۔ وہ ابھی شادی نہیں کرے گی۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد— پھر— پھر سوچے گی— لیکن ادھر ادھر کی زندگیاں دیکھ کر وہ بہت زیادہ حسّاس بلکہ شکّی ہوگئی تھی۔ کیا ہرج ہے اگر وہ شادی نہ کرے؟ اور تعلیم پائے۔ ڈگریاں لے۔ اچھی سی نوکری کرے۔ اپنا گھر بنائے—

مگر یہ ناکام زندگیاں— یہ جدائیاں— یہ طلاقیں؟ اس میں مرد سے زیادہ عورت کا قصور ہے شاید— وہ چاہے تو...... وہ سہارنا سیکھے— گھر بنانا یا بگاڑنا عورت کے ہاتھ میں ہے۔ بھابی کا مزاج— خدا کی پناہ! باجی کی خودداری اور آن بان۔ شوہر سے مقابلے.... منورما حد سے زیادہ حسّاس نہ ہوتی— اور اتنی بے زبان تو— تو— شاید خودکشی کی نوبت نہ آتی۔

امّاں اس رشتے کے خلاف تھیں۔ خاندان اور باجی کو عمر پر اعتراض تھا اور بھائی صاحب کُھلّم کُھلاّ کہتے تھے کہ مزاج کا بہت تیز ہے۔ البتہ ابّا میاں کہتے۔ ''ذہین ہے۔ اعلا تعلیم یافتہ ہے۔ اتنی پوزیشن ہے۔ درجہ، عہدہ، کیا نہ تھا ان کے پاس اور پھر یہ مسکان! خواہ مخواہ لوگ مخالفت کرتے ہیں۔ پندرہ سترہ برس کا فرق ہے، کیا ہوا۔ مرد کی عمر میں فرق ہونا ہی چاہیے— لڑکی جلدی میچور ہوجاتی ہے۔ مزاج سبھی مردوں کا تیز ہوتا ہے۔ عورت اگر مزاج شناس ہو تو— اماں، باجی، بھابی، منورما، شانتی۔ ان سب کی زندگیاں اس کی نظر میں ہیں۔ سب کی کمزوریاں بھی وہ جانتی ہے۔ اس کا عزم تھا کہ وہ ان کا دل جیتے گی۔ اس کے لیے ناگزیر بن جائے گی۔ اس کے مزاج کو سہارے گی۔ اسے خوش رکھے گی۔ میں نباہ کرنا جانتی ہوں نباہ کر کے دکھاؤں گی۔'' اور سب کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہ ان کی بن گئی۔

ایک کے بعد دوسری بیٹی ہوئی تو اس 'روشن خیال' اعلا تعلیم یافتہ مرد کے چہرے پر ناگواری کے بل پڑ گئے۔ جیسے یہ اس کے اختیار کی بات تھی۔ بچّیوں نے جانا ہی نہیں کہ باپ کی محبّت کس

چڑیا کا نام ہے۔ خالائیں، پھوپھیاں، محلّے پڑوس والے جن بچّوں کے بھولے چہروں اور پیاری باتوں پر جان دیتے، ماموں چچا جن سے اتنی محبّت کرتے وہ ڈیڈی کی صورت کو ترستی رہیں اور ماں کی محبّت سے محروم!

مگر اسے تو نباہ کرنا تھا۔ اس کے لیے اس نے وہ سہا، وہ سہا، جس کا اعتراف وہ خود اپنی ذات سے بھی کرنا نہیں چاہتی تھی! سارا خاندان یہ سمجھتا تھا کہ شوہر اسے بے حد چاہتا ہے۔ آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ ہزاروں میں کھیلتی ہے۔ ہر ضرورت اور خواہش پوری ہوتی ہے۔ ہر عیش وآرام میسر ہے۔ ایسی خوش قسمت لڑکیاں کم ہوتی ہیں۔ ''خوش قسمت''!!

ہاں اس نے سب کو یہی احساس دلایا تھا۔ وہ جلتے داغ، وہ ٹپکتے زخم، وہ مجروح خودداری، اپنائیت کا وہ مجبور احساس کس نے دیکھا؟ کون دیکھ سکتا تھا جس کو وہ پندرہ سال سے سہار رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے جلتے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی!

اس نے — اس عالی خاندان — تعلیم یافتہ — خودمختار لڑکی نے کیا کیا نہیں سہا۔ رات رات بھر ٹانگیں دبائیں — دن بھر کھانے پکائے اور اپنے ہاتھ سے کِھلائے!

جب شوشو پیدا ہوا — تو کچھ عرصے 'مجازی خدا' نے بیٹے کی ماں بن جانے کے بعد اس کا خیال کیا۔ وہ قدر اور عزت جو کچھ عرصے بعد پھر خاک میں مل گئی۔

چار بجے کی آواز پر وہ چونک پڑی۔ کھڑکی میں سے چاند کی کرنیں شیشے پر دھندلا سی گئی تھیں۔ وہ اب تک نہیں آیا۔ اور اب یہ کون سی نئی بات ہے۔ کب سے یہ آگ سینے میں بھڑک رہی ہے اور وہ ان شعلوں کو بجھانے اور دبانے کی جدوجہد میں لگی ہوئی ہے۔

''چند دن کو بھیّا کے پاس چلی جاؤں؟''

''ہاں جاؤ نا — تمھیں کسی سے محبّت ہی نہیں ہے!''

پہلی بار اس نے یہ جملہ سنا تو حیران رہ گئی۔ منھ سے نکلا۔

''کیا سچ مچ چلی جاؤں؟''

''اور کیا اسٹامپ پر لکھ کر دوں؟''

''اورتم میرے بغیر......''

''میں خوب رہ لوں گا تمھارے بغیر۔ تمھاری لڑکی اتنی بڑی ہو چکی ہے۔ اس کو محبّت دو۔ دوسرے بچّوں کو سنبھالو — میرا پیچھا چھوڑو —''

وہ گم سم حیران اس کا منھ تکتی رہی۔ وہ ایسا بے نیاز، بے تعلق بیٹھا رہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ دور کہیں سے موذّن کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے بیٹھ کر سر ڈھک لیا۔ کھڑکی میں سے پھٹتی پو کی ہلکی دودھیا روشنی پر اس کی نظریں جم گئیں۔ اوشا! اس کی زندگی میں اب اوشا کی کوئی کرن چمکے گی کیا؟ وہ لڑکی اس سے زیادہ حسین نہیں ہو سکتی۔ کل اس نے ان سے صاف صاف بات کرنے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ لیکن ایک جملہ سن کر ہی انھوں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

تم نے جو سنا سب ٹھیک ہے۔ مگر تم کون ہوتی ہو اعتراض کرنے والی۔ وہ تو میری جان کے ساتھ ہے۔ تم چاہو تو چھوڑ سکتی ہو!''

''نہیں — نہیں — نہیں —'' ہسٹیرک انداز سے اس کے منھ سے چیخیں نکلنے لگیں۔

''نہیں — آپ مجھے نہیں چھوڑیں گے — ایسی آتی جاتی عورتیں میری جگہ نہیں لے سکتیں۔ آپ کے بچّے.... بیٹیاں ہیں — بیٹا ہے.......''

''تمھیں پیسے کی کمی نہ ہوگی۔ جتنا چاہو گی ملے گا۔''

''نہیں — نہیں — نہیں — مجھے پیسے کی نہیں آپ کی ضرورت ہے۔ بچّوں کو باپ کی ضرورت ہے۔''

''بکے جا —'' اور یہ کہتے وہ باہر نکل گئے۔

اب سورج نکل آیا تھا۔ آیائیں بچّوں کو تیار کر رہی تھیں۔ نند کی آواز گونج رہی تھی۔ اس کی ملازمہ دوبارہ ناشتے کا تقاضا کرنے آ چکی تھی۔ مگر وہ اسی طرح نائٹ گاؤن میں مسہری پر بیٹھی تھی اور سوچے جا رہی تھی.....

''نہیں۔یہ شادی ٹوٹ نہیں سکتی۔ میں — میں سب سہاروں گی۔ سب کچھ جھیلوں گی۔مگر اسے چھوڑوں گی نہیں — عورت کی زندگی میں سخت وقت بھی آتے ہیں۔آج نہیں کل — کل نہیں پرسوں وہ پچھتائیں گے.....اور وہ لڑکی — وہ خود انھیں چھوڑ دے گی........میری جگہ کون لے سکتا ہے.......''

''بیگم صاحب — آپ کے نام کا خط—'' ملازمہ نے ایک بڑا سا لفافہ اس کے کانپتے ہاتھوں میں دے دیا۔'' جانے کیا ہے؟'' اس کا دل لرز رہا تھا۔ بڑی دیر بعد اس نے لفافہ چاک کیا۔

''آہ! تو وہ ٹوٹ گئی!''

طلاق نامہ اس کے ہاتھ سے فرش پر گر پڑا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیوار کو تکے جا رہی تھی اور ایک جملہ بڑبڑاتی جاتی تھی۔

''مگر وہ ٹوٹ گئی۔ٹوٹ گئی — ٹوٹ گئی —''

صالحہ عابد حسین

مشق

لفظ و معنی

منجمد	:	جما ہوا، ٹھہرا ہوا
نالاں	:	بیزار
ہراساں	:	ڈرا ہوا
اوجھل	:	نظروں سے چھُپا ہوا
ہسٹیریک انداز	:	چیخنا، چلّانا، رونا۔ہسٹیریا (Hysteria) ایک بیماری ہوتی ہے جس

میں انسان کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ مختلف طرح کی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔

خودداری : اپنی عزّت کا پاس

غور کرنے کی بات

- اس کہانی کے دو رُخ ہیں۔ اس کہانی میں جہاں لڑکیوں پر مظالم کی داستان بیان کی گئی ہے وہیں غیر ذمے دار مردوں پر طنز بھی کیا گیا ہے۔
- یہ کہانی ہمارے معاشرے کی ان خواتین کی تصویر کشی کرتی ہے جو آئے دن ایسے حالات سے مقابلہ کرتی ہیں، جیسا کہ اس کہانی میں دکھایا گیا ہے کہ شوہر کے بُرے برتاؤ کے باوجود بیوی کسی نہ کسی طرح خواہ وہ اپنے خاندان کی عزت یا اپنے بچّوں کی خاطر نباہنے کی کوشش کرتی ہے۔
- صالحہ عابد حسین کی یہ کہانی جس زمانے میں لکھی گئی اس وقت کی تعلیم یافتہ لڑکیاں ظلم سہنے کے باوجود خاموش رہتی تھیں لیکن آج کی عورت بیدار ہو چکی ہے وہ شوہر کے اس گھناؤنے عمل کے بعد خاموش نہیں بیٹھتی، اس کو صدمہ تو ضرور پہنچتا ہے لیکن اس کے بعد اس کے اندر ایک نیا عزم پیدا ہوتا ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. مصنّفہ نے بھابھی، باجی اور منورما کی شادیوں کی ناکامی کے کیا اسباب بتائے ہیں؟
2. افسانے کی ہیروئن کو پورا خاندان خوش قسمت کیوں سمجھتا تھا؟
3. افسانے کی ہیروئن ہر طرح کے حالات سے نباہ کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی تھی؟

4. اس افسانے کا ہیرو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود لڑکیوں کے پیدا ہونے پر بیوی سے ناراض کیوں تھا؟

عملی کام

- مندرجہ ذیل محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے:
  پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکنا، خاک میں ملنا، آنکھ سے اوجھل ہونا، ہزاروں میں کھیلنا
- افسانے میں ایک جگہ ''مزاج شناس'' لفظ استعمال ہوا ہے جس میں ''شناس'' لاحقہ ہے۔ آپ اس لاحقے کا استعمال کر کے تین الفاظ لکھیے۔
- اس افسانے میں استعمال ہونے والے پانچ انگریزی الفاظ لکھیے۔

مختصر مضمون

اردو میں مختصر مضمون نگاری کا آغاز سرسیّد سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اس صنف کو سماجی اصلاح کے ایک وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ اس کے بعد مضمون نگاری بھی ایک صنف کی حیثیت سے رائج ہوگئی۔ سماجی موضوعات کے علاوہ علمی، ادبی، فلسفیانہ اور دیگر موضوعات پر بھی مضامین لکھے جاسکتے ہیں۔ حالیؔ، شبلیؔ، محمد حسین آزادؔ، نذیر احمد، میر ناصر علی، نیاز فتحپوری، رشید احمد صدیقی، مرزا فرحت اللہ بیگ، محفوظ علی بدایونی، ابوالکلام آزادؔ، خواجہ غلام السیّدین وغیرہ اردو کے اہم مضمون نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

مختصر مضمون کی ایک شکل انشائیہ کہلاتی ہے۔ انشائیہ اور مضمون میں کوئی خاص فرق نہیں۔ لیکن عام طور پر انشائیہ میں مزاح اور طنز یا خوش مزاجی کا رنگ ہوتا ہے اور انشائیہ نگار اکثر باتیں اپنے حوالے سے، یا اکثر اپنے ہی بارے میں، بیان کرتا ہے۔

(1860ء – 1926ء)

عبدالحلیم نام اور شررؔ تخلص تھا۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ان کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ بعد میں ان کے والد حکیم تفضّل حسین نے ان کو کلکتہ مٹیا بُرج بُلا لیا۔ یہاں حکیم صاحب، واجد علی شاہ کی ملازمت میں تھے۔ اہلِ علم کا بھی اچھا مجمع تھا، شررؔ کی علمی نشو ونما یہیں ہوئی۔ انھوں نے اُردو، فارسی، انگریزی اور عربی میں مہارت حاصل کر لی۔ 1870ء میں شررؔ کو پھر لکھنؤ واپس آنا پڑا۔

لکھنؤ آ کر شررؔ نے اپنا علمی مشغلہ برابر جاری رکھا۔ مختلف اہلِ کمال سے فیض حاصل کرتے رہے۔ 1879ء میں وہ مزید تعلیم کے لیے دہلی گئے۔ دہلی پہنچ کر شررؔ نے نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔

دہلی سے لکھنؤ واپس آنے کے بعد 1881ء میں انھوں نے 'اودھ اخبار' کی ملازمت کر لی جس میں برابر مضامین لکھتے رہے۔ 1887ء میں شررؔ نے اپنا رسالہ 'دل گداز' جاری کیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس رسالے میں ان کے ناول 'ملک العزیز ورجنا'، 'حسن انجلینا'، 'منصور موہنا' قسط وار شائع ہونے لگے۔ کچھ مدت بعد مالی تنگیوں کی وجہ سے ان کو حیدر آباد جانا پڑا۔ یہاں رہ کر انھوں نے تاریخِ سندھ لکھنی شروع کی۔ نواب وقارالامرا نے ان کی قدر دانی کی اور اپنے بیٹے کے ساتھ 1893ء میں انگلستان بھیج دیا جہاں تین سال تک قیام رہا اور انھوں نے فرانسیسی زبان بھی سیکھ لی۔ واپس آ کر حیدر آباد سے 'دل گداز' جاری کیا۔ 1909ء میں وہ لکھنؤ واپس آ گئے اور انھوں نے یہیں وفات پائی۔

عبدالحلیم شؔرر نے اردو میں تاریخی ناول کی ابتدا کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے جن میں ایک منظوم ڈراما بھی تھا۔ ''گذشتہ لکھنؤ'' نامی کتاب میں انھوں نے نوابی لکھنؤ کے آخری زمانے کی تہذیب کا بہت دلچسپ اور معلومات افروز مرقع پیش کیا ہے۔

دیہات کی زندگی

اے شہر کے عالی شان محلوں میں رہنے والو! تمھیں نہیں معلوم کہ دیہات کے رہنے والے دنیا کا کیا لطف اٹھاتے ہیں۔ تم ایک منزلِ عشرت میں ہو۔ عالم کی نیرنگیاں تمھاری نظر سے بہت کم گزرتی ہیں۔ جس مقام پر تم ہو وہاں صبح وشام کی مختلف کیفیتیں بھی اپنا پورا پورا اثر نہیں دکھا سکتیں۔ تمھیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ آفتاب کب نکلا اور کب غروب ہوا۔ ہوا کس طرف کی چلی اور کیا بہار دکھا گئی۔ مگر غریب دیہات والے جنھیں تم اکثر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو وہ ان امور کا ہر وقت اندازہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر صبح انھیں ایک نیا لطف دیتی ہے اور ہر شام سے انھیں ایک نئی راحت نصیب ہوتی ہے۔

گاؤں کے جفاکش رہنے والے، صبح کے تارے ہنوز جھلملانے بھی نہیں پاتے کہ وہ اپنی رات کی راحت سے اکتا چکتے ہیں، ایسے وقت میں نسیم کے خوشگوار اور نازک جھونکے آتے ہیں اور بڑے ادب کے ساتھ انھیں جگانے لگتے ہیں۔ اس وقت ان کے ناز اور بادِ سحر کے نیاز دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ صبح کی ہوا نہایت شگفتگی کے ساتھ جگاتی ہے اور وہ نہیں جاگتے۔ صرف کروٹیں بدل بدل کر رہ جاتے ہیں۔ بادِ سحر یوں ہی اصرار کرتی ہوتی ہے کہ صبح کے نقیب مرغانِ سحر اٹھتے ہیں اور انھیں اٹھاتے ہیں۔ غریب محنت پسند لوگ تازہ دم اٹھ بیٹھتے ہیں۔ وقت کی کیفیتوں کو نہایت غور سے بڑے لطف کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ جھونپڑیوں سے باہر نکلے، آسمان کو دیکھا جس میں تارے جھلملا رہے تھے۔ افقِ مشرق پر نظر ڈالی جو رات بھر کے چمکے ہوئے تاروں پر غالب آئی جاتی تھی۔ کچھ کچھ نمودار ہونے والے درختوں کو دیکھا جن پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ یہ سماں انھیں اپنی خوبیاں دکھا کر بے خود کرنے کو تھا کہ انھوں نے اپنے دن کے

کام کو یاد کیا۔ آگے بڑھے اور رات کی دبی ہوئی آگ پر گری ہوئی پتّیاں جمع کر کے آگ جلائی۔ تاپ تاپ کے افسردہ ہاتھ پاؤں کو گرمایا اس کے بعد پاس کے شکستہ جھونپڑے میں جا کے بیل کھولے اور عین اس وقت جب کہ آفتاب کی کھڑی کھڑی کرنیں مشرقی کنارہ آسمان سے اوپر کو چڑھتی نظر آتی ہیں۔ یہ لوگ لمبے لمبے ہلوں کو کاندھے پر رکھ کر کھیت کی طرف روانہ ہوئے۔ کھیتوں کی مینڈوں پر جا رہے ہیں۔ اور زمین کی فیّاضیوں کو کس مسرت اور خوشی کی نظر سے دیکھتے جاتے ہیں۔ ہرے ہرے کھیت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے چلنے سے لہرا رہے ہیں۔ نظر اس خوشگوار سبزی پر عجب لطف کے ساتھ کھیلتی ہوئی دور تک چلی جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پودے جو خدا کے پاس سے دنیا والوں کی روزی لیے آتے ہیں کس قدر شگفتہ اور بشاش نظر آتے ہیں۔ رات کا برقعہ اڑھا کر آسمان نے انھیں اور زیادہ خوبصورت بنا دیا ہے۔ کیونکہ تاروں کی چھاؤں میں اس وقت ان کی نازک اور چھوٹی پتّیوں پر شبنم کے موتی جھلک رہے ہیں ایک عالمِ جواہر ہے جس پر جھلملاتے ہوئے تاروں کی شعاعیں خدا جانے کیا کیفیتیں دکھا رہی ہیں۔ ان جفاکشوں نے اس وسیع میدان کو نہایت شوق سے دیکھا جو اس وقت تو صرف ان کی نظر ہی کو خوش کرتا ہے مگر اصل میں قدرت کے ہدیے اور نیچر کے تحفے ہر جاندار کو اس کی فیّاضیوں سے ملتے ہیں۔ یہ لوگ کھیتوں میں پہنچ کر اپنی غفلت پر نادم ہو گئے کیونکہ اور لوگ ان سے پیشتر پہنچ چکے تھے۔ یہ لوگ تر و تازہ کھیتوں میں منتشر ہو گئے۔ آفتاب کی کرنوں نے جو امیر غریب سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہے کھیتوں کی مینڈوں اور کنوؤں کے کناروں پر ان کا خیر مقدم کیا۔

اب یہ لوگ اپنے کام میں مصروف ہیں کہ نیچر کے جذبات بھی ان پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتے اور قدرت کی بہار بھی ان کی دل فریبی کرنے سے عاجز ہے۔ وہ ہرا ہرا سبزہ زار، وہ سہانا سماں، وہ صبح کی بہار۔ وہ تر و تازہ ہوا وہ اُجلی کرنیں، ایسی چیزیں ہیں جن کا شوق اکثر بے چین طبیعت والوں کو شہروں سے باہر کھینچ کر لے جایا کرتا ہے۔ بار بار ہم پر ایسی وحشت سوار ہوتی ہے کہ گھر سے دو تین کوس تک نکل گئے ہیں۔ مگر یہ لوگ اپنے روزانہ کے کاموں میں ایسے مصروف ہیں کہ ان

کیفیتوں کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے، زمین کی اس استعداد کے بڑھانے میں دل وجان سے ساعی ہیں جو صرف ان کے لیے نہیں تمام دنیا کے لیے مفید ہے۔ جان توڑ کر محنت کر رہے ہیں۔ غریب کم قوّت بیل جو شاید رزق رسانیِ عالم کی فکر میں دُبلے ہوگئے ہیں ان کے ہاتھوں کی مار کھاتے ہیں اور زمین کو پیداوار کے قابل بناتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی محنت آسان کرنے کے لیے یہ لوگ نہایت دردناک آواز میں کچھ گاتے جاتے ہیں اور ان کی آواز کھلے میدان میں گونج گونج کر ایک نئی کیفیت پیدا کرتی جاتی ہے، کنوؤں کے کنارے والے پانی نکال نکال کر زمین کو سیراب اور چھوٹے چھوٹے درختوں کو زندہ کر رہے ہیں۔ دیکھو وہ کس شوق سے اس بات کے منتظر ہیں کہ ڈول اوپر آئے اور انڈیلیں اور جس وقت ڈول ان کے ہاتھ میں آجاتا ہے کس جوش کے عالم میں چلّا اٹھتے ہیں۔ پانی ان کی بڑی دولت ہے جس کی امید میں وہ آرزومند بن کر کبھی آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی کنوؤں کی طرف رخ کرتے ہیں۔

آفتاب پوری بلندی پر پہنچ کر نیچے کی طرف مائل ہوتا ہے اور جُھکتے جُھکتے افق مغرب کے قریب پہنچتے وقت باغِ عالم کی دلچسپیوں سے رخصت ہونے کے خیال میں زرد پڑ جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آفتاب کی حالت اور وضع میں اختلاف ہوجاتے ہیں۔ مگر یہ نہ تھکنے والے اور دُھن کے پکّے دہقان ایک ہی وضع اور ایک ہی صورت سے اپنا کام کیے جاتے ہیں۔ نہ محنت انھیں تھکاتی ہے نہ مشقّت انھیں ماندہ کرتی ہے۔ نہ دھوپ سے پریشان ہوتے ہیں نہ کام کرنے سے اُکتاتے ہیں۔ الغرض آفتاب غروب ہوتا ہے، دن ان سے رخصت ہوتا ہے اور یہ شام کی دلفریب کیفیتوں کا لطف بخوبی دیکھ کر یہ اُمّید لگا کر کہ کل کھیتوں کو آج سے زیادہ تروتازہ پائیں گے اپنے کھیتوں سے رخصت ہوتے ہیں۔ خوش خوش اس کچّے اور کم حیثیت گھر میں آتے ہیں جسے ہم نہایت ذلّت کی نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں۔ بی بی، غریبی کا کھانا اور فصل کے مناسب، غذا ان کے سامنے لاکر رکھ دیتی ہے اور نہ دل سے خدا کا شکر ادا کرکے کھاتے ہیں اور دوسرے دن کی محنت کا خیال کرکے اپنے تئیں سویرے ہی سُلا دیتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جس وقت شہروں کے پہر، دن چڑھے تک

سونے والے سیہ کار اپنی شرمناک زندگی کے بُرے نمونے دکھانے کے لیے جاگتے ہیں۔ زاہد نمازِ عشا پڑھ کے سو چکا ہے۔ بے فکرے گپیں اڑا رہے ہیں۔ شعرا مضمون آفرینی کی فکر میں ہیں۔ امراء کے محلوں میں کھانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ بچّے کہانیاں سن رہے ہیں۔ طلباء کتاب پر جُھکے ہوئے ہیں۔ میکش وہ پیاس بجھا رہے ہیں جو کمبخت نہیں بجھتی ہے۔ سیہ کار بدکاری کی دھن میں شہر کی سڑکیں اور گلیاں چھان رہا ہے اور جفاکش عجب میٹھی نیند میں غافل ہو گئے ہیں تاکہ تڑکے آنکھ کُھلے۔ یہ پچھلا اطمینان اور یہ سچّی آسائش بے شک حسد کے قابل ہیں۔

گاؤں عموماً قدرت کا سچّی جلوہ گاہ ہوتا ہے۔ وہاں کے سین اپنی سادگی اور دل فریب کیفیتوں کے ساتھ انتہا سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ اے شہر کے نازک خیال اور چابکدست کاریگرو! وہاں تمھاری صنّاعیوں کی بالکل قدر نہیں۔ وہاں صرف قدرت کی کاری گری عزّت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور خدا کی فیّاضیاں بڑی کامیابی اور نہایت شوق کے ساتھ پسند کی جاتی ہیں۔ ان کی خوشی کا پیمانہ بہت چھوٹا اور تنگ ہے۔ وہ بہت تھوڑے عرصہ میں خوش ہو جاتے ہیں اور ادنیٰ مسرّت ان کی دل فریبی کے لیے کافی ہوتی ہے۔ وہ لہلہاتے ہوئے سبزہ زار جنھیں وہ روز صبح وشام آتے جاتے وقت دیکھا کرتے ہیں۔ ان کے مسرور کر دینے کے لیے بہت کافی ہیں۔ وہ تر وتازہ کھیت جن سے زیادہ پیداوار کی امید ہے ان کی خوشی کو اعتدال سے زیادہ بڑھا دیا کرتے ہیں۔ دیہات کا چودھری اگرچہ اس کی حکومت چند کچّے اور ٹوٹے پھوٹے مکانوں اور ایک وسیع میدان پر محدود ہے مگر اپنے حلقہ کا پورا بادشاہ ہے۔ اس کے آگے وہاں کی مختصر آبادی میں ہر ایک کا سر جُھک جاتا ہے۔ اس کے راج کو ہر شخص بلا عذر تسلیم کر لیتا ہے۔ اس کے فیصلوں کی کہیں اپیل بھی نہیں ہوتی۔ مگر باوجود اس حکومت کے دیکھو وہ کس بے تکلفی سے اپنے مکان کے دروازے پر بیٹھا ہے۔ دنیاوی پر تکلف فرش کی ضرورت نہیں۔ میز کرسی کو وہ ناپسند کرتا ہے۔ قدرت کے سادے فرش اور خدا کی زمین پر اس کا دربار لگا ہوا ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں کو اپنے رتبہ کے قریب ہی سمجھتا ہے۔ اسی لیے نہ وہ کسی مقام پر بیٹھتا ہے اور نہ گاؤں والے کسی ذلّت کی جگہ پر بیٹھتے ہیں۔ بس یہ

حالت ہے کہ اگر عزّت ہے تو سب کی۔ اس کے گھر میں بھی وہی سامان اور فرنیچر ہے جو اس کے ماتحتوں کے گھر میں ہے۔ پیال اس کا نرم اور آرام دہ بچھونا ہے۔ کچّی مگر صاف اور لپی ہوئی کوٹھریاں اس کی خواب گاہ ہیں۔ جفاکش اور گھر گرہست بہو بیٹیوں کے ہاتھ پاؤں اس کے خادم ہیں کوٹھریوں میں بھرا ہوا غلّہ اس کی دولت ہے۔ چند دبلے اور لاغر مویشی اس کا قیمتی سرمایہ۔ ایک کم حیثیت مکان اس کی کوٹھی ہے اور اِردگرد کے کھیت اور آس پاس کا سبزہ زار اس کا جانفزا باغ ہے۔

گاؤں والوں کی یہ بات کس قدر قابلِ ذکر ہے کہ وہ ایک سادی اور بسیط حالت پر ہیں۔ ان کی کفایت شعاری کی زندگی کس صفائی اور اطمینان سے گزرتی ہے۔ ان کی فکریں ہمارے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ وہ ہمارے روپیہ پیسہ کے بھی محتاج نہیں۔ ہمارا سکّہ بھی ان میں بہت کم مروّج ہے۔ کیونکہ ان کی نظر ہر وقت رزّاقِ مطلق کی طرف لگی رہتی ہے اس لیے وہ خدا کی بے واسطہ ضیافتوں ہی سے سونے کا کام بھی نکال لیتے ہیں۔ غلّہ اور اناج ان کا سکّہ ہے۔ دنیا کی ہر چیز جو ان کی ضرورتیں رفع کر سکتی ہے، غلّہ کے عوض میں ان کو بہ آسانی اور بہ کفایت مل سکتی ہے۔

غریب دیہاتیوں کی یہ بات اس قابل ہے کہ ہم ان سے ایک کارآمد سبق لیں۔ اتّفاق ان کی قوّت ہے اور باہمی ہمدردی ان کا ہتھیار ہے۔ افلاس اور آفاتِ سماوی بھی کبھی ان کی دشمن ہو جاتی ہے۔ مگر وہ اس ہتھیار کو لے کر اٹھتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ کھیتوں میں پانی پہنچاتے وقت وہ باہم ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ کھیتوں میں بیج ڈالتے وقت وہ ایک دوسرے کو غلّہ قرض دیتے رہتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک عالم کی فکر اپنے سر لیتے ہیں اور دنیا بھر کے لیے خود مصیبت میں پھنستے ہیں۔ ہم بےفکر ہیں اور اپنی اغراض اور بقائے زندگی کے اسباب بھولے ہوئے ہیں۔ مگر ہماری طرف سے اس کام کو وہ پورا کرتے ہیں۔ اس جفاکشی کے انعام میں خدا کی طرف سے انھیں جو کچھ ملتا ہے اس میں سے خود بہت کم لیتے ہیں اور سب ہمارے حوالے کر دیتے ہیں۔

ایک کسان کی زندگی پر غور کرو اور اس کی سالانہ محنت ومشقّت کا اندازہ کرو کہ کس طرح جان توڑ توڑ کر اور اپنے تئیں مِٹا مِٹا کر جفاکشی پر تُلا رہتا ہے اور اس کے بعد یہ غور کرو کہ وہ کس لیے اس مصیبت میں پڑتا ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ دنیا کا کتنا بڑا ہمدرد ہے اور حُبِّ ملک اس کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بے شک وہ ساری دنیا کے لیے یہ محنت کرتا ہے اور اس سے زیادہ نوعِ انسان کا دوست دنیا بھر میں نہ ملے گا۔

اے ہمدردئ قوم کا لفظ بار بار زبان پر لانے والو! اگر اپنی کوششوں کا کچھ نتیجہ دیکھنا چاہتے ہو تو ان غریب، جفاکش دہقانوں کی پیروی کرو۔ قوم کی کھیتی روز بروز کملاتی جاتی ہے اور چند روز میں بالکل سوکھ جائے گی۔ تمھارا فرض ہے کہ جلدی اُٹھو اور جس طرح ہو سکے اپنی راحت بیچ بیچ کر ان کھیتوں میں پانی پہنچاؤ۔ قومی کھیت کے پودے یعنی موجودہ نسل بھی نہ سنبھلی تو کہیں کے نہ رہو گے۔

عبدالحلیم شرؔر

مشق

لفظ و معنی

عشرت : عیش

نیرنگی : حیرت پیدا کرنے کی قوّت، وہ صفت جس سے لوگ تعجب یا فکر میں پڑ جائیں

حقارت : عزّت کی نگاہ سے نہ دیکھنا

امور : امر کی جمع، یعنی کام، باتیں

ہدیہ	:	تحفہ
جفاکش	:	محنتی
ہنوز	:	اب تک
بادِسحر	:	صبح کی ہوا
نقیب	:	اعلان کرنے والا
نمودار	:	ظاہر، نمایاں
سماں	:	منظر
افسردہ	:	اداس
فیّاضی	:	دریادلی، سخاوت
بشّاش	:	خوش
شعاعیں	:	کرنیں
منتشر	:	پھیلا ہوا، بکھرا ہوا
وحشت	:	گھبراہٹ، دیوانگی
استعداد	:	اہلیت، لیاقت
رزق رسانی	:	روزی پہنچانا
اُفق	:	وہ جگہ جہاں زمین وآسمان ملتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں
وضع	:	شکل، بناوٹ
ماندہ	:	تھکا ہوا
میکش	:	شرابی
چابکدست	:	مشّاق، ہنرمند
صنّاعی	:	کاریگری

بسیط : پھیلا ہوا

مروّج : رائج، جس کا چلن ہو

آفاتِ سماوی : آسمانی بلائیں

بقا : باقی رہنا

رزّاقِ مُطلق : خدا، جسے رزق دینے کا پورا اختیار ہے۔

ضیافت : دعوت

غور کرنے کی بات

- شہری زندگی کے مقابلے میں گاؤں کی زندگی ماحولیاتی آلودگی سے پاک ہوتی ہے۔لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوکر فطری ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں۔
- دیہات کے ماحول میں فطرت اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔
- سادگی، جفاکشی، انسانی ہمدردی، آپسی بھائی چارہ اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا جذبہ دیہی زندگی کی اہم خصوصیات ہیں۔
- کسان دنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لیے سخت محنت ومشقّت کرتے ہیں۔ ملک کی ترقی میں اُن کا اہم کردار ہوتا ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. دیہات کے رہنے والے زندگی کا کیا لطف اٹھاتے ہیں؟
2. شہر کے مقابلے میں گاؤں کی زندگی کس طرح مختلف ہوتی ہے؟
3. دیہی زندگی کی وہ کون سی خصوصیات ہیں جن سے قوموں اور ملکوں کی ترقّی وابستہ ہے؟
4. اس سبق میں مصنف نے کسان کی زندگی کے کن پہلوؤں پر غور کرنے کا مشورہ دیا ہے؟

عملی کام

- اس مضمون کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔
- آپ نے کوئی گاؤں ضرور دیکھا ہوگا۔ اس پر ایک مضمون لکھیے۔
- ذیل کے الفاظ میں جمع کی واحد اور واحد کی جمع بنایئے:

منزل ، امور، تحفہ، جذبات، شاعر، امیر ، کتاب، خادم ، آفت، اسباق ،اسباب، اغراض،غریب

- درج ذیل اقتباس کا مطلب اپنے الفاظ میں لکھیے:

''گاؤں والوں کی یہ بات کس قدر قابل ذکر ہے کہ وہ ایک سادی اور بسیط حالت پر ہیں۔ ان کی کفایت شعاری کی زندگی کس صفائی او راطمینان سے گزرتی ہے۔ان کی فکریں ہمارے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ وہ ہمارے روپیہ پیسہ کے بھی محتاج نہیں۔ ہمارا سکّہ بھی ان میں بہت کم مروّج ہے۔ کیونکہ ان کی نظر ہر وقت رزّاقِ مطلق کی طرف لگی رہتی ہے۔ اس لیے وہ خدا کی بے واسطہ ضیافتوں ہی سے سونے کا کام بھی نکال لیتے ہیں۔''

مرزا فرحت اللہ بیگ

(1884ء – 1947ء)

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کرنے کے بعد ہندو کالج سے 1905ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ 1907ء میں وہ حیدر آباد گئے اور مختلف ملازمتوں پر مامور رہے اور ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ ہوم سکریٹری کے عہدے تک پہنچے۔ 1919ء میں انھوں نے اپنا سب سے پہلا مضمون رسالہ ''افادہ'' آگرہ میں لکھا۔ اور 1923ء سے وہ باقاعدہ مضامین لکھنے لگے۔ انھوں نے تنقید، افسانہ، سوانح حیات، معاشرت اور اخلاق ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھا اور اچھا لکھا لیکن ان کے مزاحیہ مضامین سب سے زیادہ کامیاب ہوئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین سات جلدوں میں 'مضامینِ فرحت' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ نظم کا مجموعہ 'میری شاعری' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس میں بھی مزاحیہ رنگ نمایاں ہے۔

ہنسنے اور ہنسانے کا کوئی اصول مقرّر نہیں ہو سکتا۔ تمام مزاح نگار اپنا انداز جدا رکھتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا بھی ایک مخصوص رنگ ہے، جسے عظمت اللہ بیگ نے 'خوش مذاقی' کہا ہے۔ خوش مذاقی میں قہقہے کے مواقع کم اور تبسم کے زیادہ ملتے ہیں۔ ان کے یہاں ایسا انبساط ملتا ہے جسے دیرپا کہا جا سکتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے یہاں دلچسپی کے کئی سامان ہیں۔ ان کی مزاح نگاری میں دلّی کے روزمرہ اور محاورات کا لطف پایا جاتا ہے۔ وہ اکثر ایسے محاورات اور الفاظ اپنی تحریر میں لاتے ہیں جو دلّی کے لوگ گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون ان کی انھیں خصوصیات

کا آئینہ دار ہے۔ اس کی مزید خوبی یہ ہے کہ اس سے ہمیں اردو کے ایک بہت بڑے ادیب اور انیسویں صدی کے ہندوستان کے ایک بڑے شخص مولوی نذیر احمد کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اور کسی طرح نہ معلوم ہو سکیں۔

نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی

مولوی صاحب کا حلیہ سنیے:

رنگ سانولا مگر روکھا، قد خاصا اونچا۔ مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا دوہرا بدن گدرا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں کسی قدر ورزش کا شوق تھا۔ ورزش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح مرمروں کا تھیلا ہو جاتا ہے بس یہی کیفیت تھی۔ بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لیے اس کا تکملہ اونچی تر کی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا۔ کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ۔ توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کمر میں ازار بند باندھنے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا جاتا تھا۔ گرمیوں میں تہمد (تہ بند) باندھتے تھے۔ اس کے پلّو اُڑسنے کے بجائے اِدھر اُدھر ڈال لیتے تھے مگر اٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے اوّل تو قطب بنے بیٹھے رہتے تھے۔ اگر اٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے کہ نہیں۔ ضرورت نے بہت ہی مجبور کیا تو ازار بند کی گرہ یا تہمد کے کونوں کے اڑسنے کا دباؤ توند پر ڈالتے تھے سر بہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا۔ جو تھوڑے رہے سہے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیے جاتے تھے ورنہ بالوں کی یہ گنگر سفید مقیش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوتی تھی بھویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ فگن تھیں۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی وہ چمک نہیں جو غصّہ کے وقت نمودار ہوتی ہے بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر میں ان کو 'مسکراتی ہوئی آنکھیں'

کہوں تو بیجا نہ ہوگا کلّہ جبڑا بڑا زبردست پایا تھا چونکہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لیے گنجائش بڑھادی تھی۔ اس لیے نہایت اونچی آواز میں بغیر کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ کوئی دور سے سنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو۔ جوش میں آ کر جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ترم بج رہا ہے اس لیے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے ناک کسی قدر چھوٹی تھی اور نتھنے بھاری، ایسی ناک کو گنواروں کی اصطلاح میں ' گاجز' اور دلّی والوں کی بول چال میں 'پھُلکی' کہا جاتا ہے۔ گو متانت چھو کر نہیں گئی تھی لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بہ خود متانت پیدا کر دی تھی۔ داڑھی بہت چھدری تھی ایک ایک بال بآسانی گنا جا سکتا تھا داڑھی کی وضع قدرت نے خود فرینچ فیشن بنادی تھی۔

انھوں نے اپنے بارے میں بتایا لو بھئی ہم بہت غریب لوگ تھے نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا تعلیم کا شوق تھا اس لیے پھرتا پھراتا پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں آ کر ٹھہر گیا یہاں کے مولوی صاحب بڑے عالم تھے ان سے پڑھتا اور توکل پر گزارہ کرتا۔ مولوی صاحب کے دو چار شاگرد اور بھی تھے انھیں بھی پڑھاتے اور مجھے بھی پڑھاتے دن رات پڑھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا تھوڑے سے دنوں میں، میں نے کلام مجید پڑھ کر ادب پڑھنا شروع کیا چار برس میں معلّقات پڑھنے لگا گو میری عمر بارہ سال کی تھی مگر قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے نو دس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھڑی ہاتھ میں لے گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دے دی کسی نے قیمہ کی لگدی ہی رکھ دی کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخایا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے انھیں کے بیٹے ڈپٹی عبدالحامد ہیں جو سامنے والے مکان میں رہتے ہیں ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا ادھر میں نے دروازے میں قدم رکھا ادھر

ان کی لڑکی نے ٹانگ لی جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلّہ بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی تھی پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹّہ انگلیوں پر مارا بخدا جان سی نکل جاتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے کئی دفعہ شکایت بھی کی مگر انھوں نے ٹال دیا، خبر نہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی تاکید کر دیا کرتے تھے کہ عبدالخالق صاحب کے مکان میں ضرور جانا بہر حال اس مارا دھاڑی سے روزانہ وہاں جانا پڑتا تھا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی تھی۔ تم سمجھے بھی یہ لڑکی کون تھی میاں یہ لڑکی وہ تھی جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں۔ جب سوچتا ہوں تو پچھلا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ اکثر ہم دونوں پہلی باتوں کو یاد کرتے اور خوب ہنستے تھے۔ خدا غریقِ رحمت کرے جیسی بچپن میں شریر تھیں ویسی ہی جوانی میں غریب ہو گئیں۔

ایک روز جو کشمیری دروازے کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دہلی کالج میں بڑا ہجوم ہے کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ اسکول ہے۔ میں بھی بھیڑ میں گھس گیا معلوم ہوا کہ لڑکوں کا امتحان لینے مفتی صدرالدین صاحب آئے ہیں۔ ہم نے کہا چلو ہم بھی چلیں، برآمدے میں پہنچا قد چھوٹا تھا لوگوں کی ٹانگوں میں سے ہوتا ہوا گھس گھسا کر کمرے کے دروازہ تک پہنچ ہی گیا۔ دیکھا کہ کمرے کے بیچ میں میز بچھی ہے۔ اس کے سامنے کرسی پر مفتی صاحب بیٹھے ہیں، ایک لڑکا آتا ہے اس سے سوال کرتے ہیں اور سامنے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے ہیں میز کے دوسرے پہلو کی کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے یہ مدرسے کے پرنسپل صاحب تھے ہم تماشہ میں محو تھے کہ صاحب کسی کام کے لیے اٹھے چپراسیوں نے راستہ صاف کرنا شروع کیا جو لوگ دروازہ روکے کھڑے تھے وہ کسی طرح پیچھے ہٹتے ہی نہیں تھے چپراسی زبردستی ڈھکیل رہے تھے غرض اس دھکا پیل میں میرا اقلیہ ہو گیا، دروازہ کے سامنے سنگِ مرمر کا فرش تھا اس پر سے میرا پاؤں رپٹا اور میں دھم سے گرا، اتنی دیر میں پرنسپل صاحب بھی دروازے تک آ گئے تھے۔ انھوں نے جو مجھے گرتے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف

بڑھے، مجھے اٹھایا، پوچھتے رہے کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔ ان کی شفقت آمیز باتیں اب تک میرے دل پر کالنقش فی الحجر ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں پوچھا۔ ''میاں صاحب زادے کیا پڑھتے ہیں؟'' میں نے کہا کہ ''معلّقات''۔ ان کو بڑا تعجب ہوا پھر پوچھا۔ میں نے پھر وہی جواب دیا۔ میری عمر پوچھی، میں نے کہا، ''مجھے کیا معلوم؟'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بجائے اپنے کام کو جانے کے سیدھا مجھ کو مفتی صاحب کے پاس لے گئے اور کہنے لگے ''مفتی صاحب یہ لڑکا کہتا ہے میں معلّقات پڑھتا ہوں۔ ذرا دیکھیے تو سہی سچ کہتا ہے یا یونہی باتیں بناتا ہے۔'' مفتی صاحب نے کہا۔ ''بولو تو کیا پڑھتا ہے''؟ میں نے کہا ''معلّقات'' کہنے لگے کہاں پڑھتا ہے؟'' میں نے کہا پنجابیوں کے کٹرے کی مسجد میں۔'' پھر کہا ''معلّقات دوں، پڑھے گا'' میں نے کہا ''لائیے'' انھوں نے میز پر سے کتاب اٹھائی اور میرے ہاتھ میں دے دی۔ اور کہا ''یہاں سے پڑھ'' جس شعر پر انھوں نے انگلی رکھی تھی وہ معلّقات سے عمرو بن کلثوم کا شعر تھا۔ اسے میں نے پڑھا اور معنی بیان کیے۔ انھوں نے ترکیب پوچھی وہ بیان کی مفتی صاحب بہت چکرائے۔ پوچھنے لگے ''تم کو کون پڑھاتا ہے''؟ میں نے کہا مسجد کے مولوی صاحب کہا ''مدرسے میں پڑھے گا؟'' میں نے جواب دیا ''ضرور پڑھوں گا۔'' مفتی صاحب نے کاغذ اٹھا کر چند سطریں لکھیں اور پرنسپل صاحب کو دے کر کہا ''اس کو پریسڈینٹ صاحب کے پاس پیش کر دینا۔'' ہم وہاں سے نکل کر اپنے گھر آئے مولوی صاحب سے کچھ نہ کہا۔ کوئی سات آٹھ روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس ایک کاغذ دے گیا اس میں لکھا تھا کہ نذیر احمد کو کالج میں داخل کرنے کی اجازت ہوگئی ہے۔ کل سے آپ اسے کالج میں آنے کی ہدایت کر دیجیے۔ اس کا وظیفہ بھی ہو گیا ہے۔ چپراسی تو یہ حکم دے چلتا بنا۔ مولوی صاحب نے مجھے بلایا خط دکھایا اور پوچھا یہ معاملہ کیا ہے میں نے کچھ جواب نہ دیا جب ذرا سختی کی تو تمام واقعہ بیان کیا وہ بہت خوش ہوئے اور دوسرے روز لے جا کر میرا ہاتھ پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس زمانے میں سید احمد خان فارسی کی جماعت میں تھے۔ منشی ذکاءاللہ حساب کی

جماعت میں اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے، میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا۔

میں نے کہا مولوی صاحب آپ کی جماعت کہاں بیٹھتی تھی کہنے لگے پرنسپل صاحب کے کمرے کے بازو میں جو چھوٹا کمرہ ہے اس میں ہماری جماعت تھی۔ دوسرے پہلو میں جو کمرہ ہے اس میں فارسی کی جماعت'' دانی نے کہا مولوی صاحب آپ کے اختیاری مضامین کیا تھے؟'' مولوی صاحب ہنسے اور کہا ''میاں دانی''، ہم پڑھتے تھے آج کل کے طالب علموں کی طرح گھاس نہیں کاٹتے تھے۔ مولوی صاحب اس فقرے کا بہت استعمال کرتے تھے۔ ارے بھئی ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے۔ آج کل پڑھاتے نہیں لادتے ہیں۔ آج پڑھا کل بھوٗلے۔ تمھاری تعلیم ایسی دیوار ہے جس میں گارے کا بھی رد ّا ہے۔ ٹھیکریاں بھی گھسیڑ دی ہیں۔ مٹی بھی ہے پتھر بھی ہے کہیں چونا اور اینٹ بھی ہے ایک دھکّا دیا اور اڑ اا ڑ ادھم گر گئی۔ ہم کو اس زمانے میں ایک مضمون پڑھاتے تھے مگر اس میں کامل کر دیتے تھے۔ پڑھانے والے بھی ایرے غیرے پچکلیاں نہیں ہوتے تھے۔ ایسے ایسے کو چھانٹا جاتا تھا جن کے سامنے آج کل کے عالم محض کاٹھ کے اُلّو ہیں۔

مولوی صاحب کو اپنے ترجمے پر بڑا ناز تھا اور اکثر اس کا ذکر فخریہ لہجے میں کیا کرتے تھے۔ اردو ادب میں ان کی جن تصنیفات نے دھوم مچا رکھی ہے ان کے نزدیک وہ بہت معمولی تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ'' میری تمام عمر کا صلہ کلام مجید کا ترجمہ ہے۔ اس میں مجھے جتنی محنت اٹھانی پڑی ہے اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ ایک ایک لفظ کے ترجمے میں میرا سارا سارا دن صَرف ہو گیا۔ میاں سچ کہنا کیسا محاورہ کی جگہ محاورہ بٹھایا ہے۔'' ہم نے کہا۔ مولوی صاحب بٹھایا نہیں ٹھونسا ہے۔ جہاں یہ فقرہ کہا مولوی صاحب اچھل پڑے۔ بڑے خفا ہوتے اور کہتے'' کل کے لونڈو! میرے محاوروں کو غلط بتاتے ہو۔ میاں میری اردو کا سکّہ تمام ہندوستان پر بیٹھا ہوا ہے خود لکھو گے تو چیں بول جاؤ گے۔''

مولوی صاحب نے کئی مرتبہ اس عاجز پر بھی رقمی حملے کیے لیکن یہ ذرا ٹیڑھا مقابلہ تھا۔ایک چھوڑ کئی کتابیں مولوی صاحب سے اینٹھیں کبھی ایک پیسہ نہ دیا۔ یہ نہیں کہ خدانخواستہ وعدہ کرتا اور رقم نہ دیتا تھا۔ یہ کہ اس وقت تک کتاب لیتا ہی نہ تھا۔ جب تک مولوی صاحب خود نہ فرما دیتے کہ ''اچھا بھئی تو یوں ہی لے جا مگر میرا پیچھا چھوڑ دے۔'' میری ترکیب یہ تھی کہ پہلے کتاب پر قبضہ کرتا، مولوی صاحب کتاب کی قیمت مانگنے میں حجت کرتے، وہ جواب دیتے ۔ میں اس کا جواب دیتا ریویو کے لیے جو کتابیں آتی تھیں وہ تو ہمارے باپ دادا کا مال تھیں کتابیں تو کتابیں میں نے مولوی صاحب کی ایل ایل ڈی کی گون پر بھی قبضہ کرنے کا فکر کیا تھا۔

حیدرآباد آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ اس چہکتے ہوئے بلبل نے اس گلشنِ دنیا سے کوچ کیا۔ جب کبھی دہلی جاتا ہوں تو مولوی صاحب کے مکان پر ضرور جاتا ہوں اندر قدم نہیں رکھتا مگر باہر بڑی دیر تک دیوار سے لگ کر دروازے کو دیکھتا ہوں اور رہ رہ کر ذوقؔ کا یہ شعر زبان پر آتا ہے۔

یہ چمن یونہی رہے گا اور سارے جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اللہ بس باقی ہوس

مرزا فرحت اللہ بیگ

مشق

لفظ و معنی

حلیہ : شکل، صورت

تکملہ	:	تکمیل
قطب بنے بیٹھے رہتے	:	اولیاء اللہ میں کچھ لوگ 'قطب' کے درجے پر ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی جگہ یعنی اپنے گھر سے کہیں باہر نہیں جاتے۔ اسی لیے فارسی میں کہاوت ہے 'قطب از جا نمی جنبد' (قطب اپنی جگہ سے نہیں ہلتا)
مُرمُرا	:	بھُنے ہوئے چاول
مقیّش	:	سونے چاندی کے تار
سایہ فگن	:	سایہ ڈالنے والا
نمودار	:	ظاہر، نمایاں
شوخی	:	چلبلا پن
ذہانت	:	دماغ کی تیزی، ذہن
محیط	:	پھیلاؤ، احاطہ کیا ہوا
اصطلاح	:	کسی علمی یا فنی شعبے کا کوئی لفظ جسے عام معنوں کے علاوہ خاص معنوں میں استعمال کیا گیا ہو۔
متانت	:	سنجیدگی، وقار، بھاری پن
وضع	:	ڈھنگ
توکّل	:	خدا پر بھروسہ کرنا
معلّقات	:	معلّق کی جمع، کہا جاتا ہے کہ قدیم عرب میں طریقہ تھا کہ ہر سال کی شاعری کے سب سے اچھے نمونوں کو خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں کر دیا جاتا تھا۔ ان نظموں کو جو قصیدے کی ہیئت میں ہوتی تھیں 'معلّقات' (لٹکائی ہوئی) کہا جاتا ہے۔ ان

کی تعداد سات بتائی گئی ہے۔

عمرو بن کلثوم : عربی کا مشہور شاعر، 'عمرو' میں عین پر زبر اور میم پر جزم ہے اور واو نہیں پڑھا جاتا۔ یعنی 'عمرو' کو Amr پڑھیے

کالنقش فی الحجر (عربی) : پتھر پر بنائے ہوئے نقش کی طرح، لہٰذا جو بات کبھی بھلائی نہ جاسکے۔

پچکلیاں : مختلف رنگوں سے رنگا ہوا (وہ جانور جس کے چاروں پیر اور ماتھا سفید ہو)

حُجّت : دلیل، بحث

ریویو (انگریزی) : تبصرہ (Review)

غور کرنے کی بات

- اس مضمون میں نذیر احمد کی شکل، صورت، وضع قطع اور حلیہ کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ نذیر احمد نے تعلیم کس قدر مشقت سے حاصل کی۔
- مضمون میں نذیر احمد کے زمانے کی معیاری اور مفید تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. نذیر احمد کی شخصیت کے دلچسپ پہلوؤں کو اپنے الفاظ میں لکھیے۔
2. نذیر احمد نے اپنے بچپن کے کن واقعات کو لطف لے کر بیان کیا ہے؟ بتائیے۔
3. نذیر احمد کے ساتھ پڑھنے والوں میں کون کون سے ادیب شامل تھے؟

4. نذیر احمد نے آج کل کی تعلیم کی کون کون سی خامیاں بتائی ہیں؟

عملی کام

- اس سبق کا بغور مطالعہ کیجیے اور بتایئے کہ آپ کو نذیر احمد کی کون سی باتیں سب سے اچھّی لگی ہیں۔
- سبق میں جہاں مزاحیہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی نشاندہی کیجیے۔
- سبق کا خلاصہ تحریر کیجیے۔
- اس سبق میں جو محاورے استعمال ہوئے ہیں انھیں تلاش کر کے لکھیے۔

خواجہ غلام السیّدین

(1904ء – 1971ء)

خواجہ غلام السیّدین ہریانہ کے تاریخی قصبے پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ غلام الثّقلین علی گڑھ کالج کے نامور طالب علم تھے اور والدہ مشتاق فاطمہ حالؔی کی پوتی تھیں۔ غلام السیّدین کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم پانی پت میں ہوئی۔ کالج کی تعلیم کے لیے وہ علی گڑھ گئے جہاں انھوں نے بی۔اے اور بی۔ایڈ کیا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ وہاں سے آکر علی گڑھ ٹیچرز ٹریننگ کالج میں لیکچرر رہوئے اور پھر پرنسپل ہوگئے۔

خواجہ غلام السیّدین ماہرِ تعلیم تھے۔ انھوں نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد ہندوستان میں تعلیمی اُمور کے سلسلے میں کئی مقامات پر مختلف حیثیتوں سے کام کیا۔ انھوں نے گاندھی جی کی عملی تعلیم سے متعلق ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ خاکہ تیار کیا۔ غلام السیّدین کو اُردو زبان اور ادب سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے اردو میں تعلیم اور ادب سے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اُن کی مشہور کتاب 'آندھی میں چراغ' ہے جس پر انھیں ساہتیہ اکاڈمی کا انعام بھی ملا۔ حکومتِ ہند نے ان کی تعلیمی خدمات پر انھیں 'پدم بھوشن' کے خطاب سے نوازا۔ انھیں دنیا کے سات ماہرِ ین تعلیم میں شمار کیا جاتا تھا۔

خواجہ غلام السیّدین کی نثر نہایت سادہ لیکن پُر زور اور موثر ہوتی ہے۔ وہ اپنی بات کو بیان کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے الفاظ سے وہ کام لیتے ہیں جو بہت سے لوگ بڑے بڑے الفاظ سے بھی نہیں لے سکتے۔

جینے کا سلیقہ

میں ایسے مشاہیر کی صحبت میں بیٹھا ہوں جن کی گفتگو میں وہ لوچ، دل آویزی اور سلیقہ ہوتا تھا کہ وہاں سے اُٹھنے کو دل نہ چاہے مثلاً سر تیج بہادر سپرو، سروجنی نائیڈو، مولانا آزاد، سیّد راس مسعود، ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین، یعنی یہ کیفیت کہ: وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

اس کشش کی وجہ محض یہ نہ تھی کہ وہ زبان پر قدرت رکھتے تھے یا رکھتے ہیں بلکہ ان کا دماغ روشن اور مرتّب تھا۔ اُنھیں دراصل کچھ کہنا ہوتا تھا۔ ان کی سیرت ان کے تجربوں سے مالا مال تھی۔ وہ اپنے سُننے والوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انھیں اپنی زندگی اور تجربوں میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ اور جمہوریت کے اس زمانے میں جب زبان سے ترغیب اور تبادلۂ خیال کا زیادہ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے، اچھّی گفتگو نہ صرف ایک سماجی ہنر ہے بلکہ ایک سیاسی ہتھیار بھی ہے، جس کا صحیح استعمال سیکھنا ضروری ہے۔

اچھّے لوگوں اور اچھّی کتابوں کی صحبت کے علاوہ تیسری چیز جو اچھّی زندگی کی بنیاد ہے، وہ کام ہے۔ اس سے متعلق ہمارے صدر محترم ذاکر حسین نے اپنے ایک خطبے میں لکھا ہے کہ "کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ کام کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں، کام خالی دل لگی نہیں، کام کھیل نہیں، کام کام ہے۔ بامقصد محنت ہے۔ کام دشمن کی طرح آپ اپنا محاسبہ کرتا ہے اور اس میں جو پورا اُترتا ہے، تو وہ خوشی دیتا ہے جو اور کہیں نہیں ملتی۔ کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے۔" واقعہ یہ ہے کہ انسان کی شخصیت اس وقت تک کسی حسین سانچے میں نہیں ڈھل سکتی، جب تک اس کے دل

میں اس انداز سے کام کرنے کی لگن پیدا نہ ہو، حقیر سے حقیر کام میں معنی اور لطف پیدا ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ کام کرنے والا اس کا رشتہ بڑے مقصد کے ساتھ قائم کرے۔ دو مزدور ایک پہاڑ پر پتھر توڑ رہے تھے۔ ایک رہ گیر نے پہلے سے پوچھا ''تم کیا کر رہے ہو؟'' اس نے جل کر جواب دیا۔ ''دیکھتے نہیں ہو، اپنی قسمت کے لکھے پتھر پھوڑ رہا ہوں۔'' ذرا اور آگے بڑھ کر اس نے دوسرے مزدور سے بھی یہی سوال کیا تو اس نے بہت فخر اور خوشی کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں ایک گرجا کی تعمیر کر رہا ہوں۔'' دیکھا آپ نے؟ پتھر وہی تھے لیکن ایک مزدور ان سے اپنی قسمت پھوڑ رہا تھا، اور دوسرا ایک عبادت گاہ بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ہمارے ملک میں نہ صرف طلبہ بلکہ سب لوگوں کو کام کرنے کے صحیح آداب سکھانے کی ضرورت ہے۔ کسی کام کو سرسری انداز میں کرنا گویا سر سے ایک ناگوار بوجھ اتارنا ہے، نہ اس میں خوشی تلاش کرنا، نہ پانا، نہ اس حسین تکمیل میں فخر محسوس کرنا، نہ اس کے ذریعے اپنی دنیا کو سمجھنا اور اپنے ہم جنسوں کے دُکھ سُکھ میں شریک ہونا۔ یہ سب نہ تو ذہنی دیانت کا تقاضا ہے، نہ اخلاق کا۔ زندگی خدا کا ایک انمول عطیہ ہے اور وہ تمام صلاحیتیں اور ہنرمندیاں اور جوہر، جو اس کے ساتھ قدرت ہمارے کیسے میں ڈالتی ہے، ان کی قیمت انسان صرف کام کے ذریعے اور کام کے سکّے میں ادا کر سکتا ہے۔ جو شخص اس قیمت کو خوش دلی اور ایمانداری کے ساتھ ادا نہیں کرتا، اس کی حیثیت میرے نزدیک ایک چور کی ہے وہ خود کا چور ہے، سماج کا چور اور خدا کا چور ہے۔

لیکن جینے کا سلیقہ صرف بڑے بڑے اصولوں کی پابندی پر ہی منحصر نہیں۔ اس میں بہت سی چھوٹی چیزیں بھی ہیں۔ ایک معمولی انسان کی زندگی کا ہر لمحہ ایسی سطح پر بسر نہیں ہوتا جہاں ہر قدم پر منصور کی طرح اناالحق کہنے کی ضرورت ہے۔ اس میں اس سے بھی زیادہ اہمیت ہے۔ ایسی بظاہر معمولی صفات کی جو انسانی رشتوں میں خوشگواری پیدا کرتی ہیں۔ یہ کون سی صفات ہیں؟ آپس

کے میل جول میں دوستی اور مہربانی، معاملات میں انصاف، سچّائی اور بھروسا، مل جل کر کام کرنا، دوسروں کے حقوق کی پاسداری اور ان کی رائے کا احترام، خوش مزاجی اور ظرافت اور خواہ مخواہ کی دل شکنی اور بدگوئی سے پرہیز۔ میرا خیال ہے کہ ہماری آئے دن کی زندگی میں بہت سے نفسیاتی دکھ اور محرومیاں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ ہم اپنے دوستوں، عزیزوں اور ہم جنسوں سے مہربانی، فیّاضی اور ہمدردی کا سلوک نہیں کرتے۔ ان کے بارے میں دوسرے لوگوں کے سامنے غیر ذمے داری کے ساتھ ایسی بات چیت کرتے ہیں جس سے ان کی نیک نامی پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ یا محض تفریحاً اور گرمیِ محفل کی خاطر ایسی گفتگو میں شامل ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کی برائی کو بغیر جانچ پڑتال کے آسانی سے مان لیتے ہیں، ان کو شبہ کا فائدہ بھی نہیں دیتے بلکہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بے قصور ہیں، ہم جرأت سے کام لے کر ان کے حق میں کلمۂ خیر نہیں کہتے۔ لیکن دراصل لوگوں کے بارے میں حسنِ ظن رکھنا اور ان کی اچھی باتوں کی تلاش اور قدر کرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم ان کی طرف سے بدظن رہیں اور ان کی عیب جوئی کرتے رہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض دفعہ انسان ہر کسی کو شریف اور قابلِ اعتماد سمجھ کر نقصان اٹھاتا ہے لیکن اخلاقی اور سماجی اعتبار سے یہ نقصان بہت کم ہے اور اس کے مقابلے میں دل تنگی، بدبینی اور شبہے کی ذہنیت سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ جو شخص اس قسم کی طبیعت اور دل و دماغ رکھتا ہے، وہ عمر بھر کے لیے ایک روگ خرید لیتا ہے، نہ خود خوش رہ سکتا ہے، نہ دوسروں کو خوش رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے خوش مزاجی روزمرّہ کی زندگی اور رشتوں میں لطف اور شیرینی پیدا کرتی ہے اور صحیح قسم کی ظرافت بہت سی ناگواریوں کا علاج ہے۔ وہ ظرافت جس کا مقصد دل دُکھانا نہ ہو، جو دل سوزی اور ہمدردی کے ساتھ حماقتوں پر طنز کرے، لیکن کسی کی ذاتی تحقیر نہ کرے، جو دوسروں سے زیادہ خود اپنی حماقتوں کا خاکہ اڑائے اور اپنے بارے میں دوسروں کی ظرافت کو جھیل سکے۔ جو شخص خود کو بہت اہم سمجھتا ہے، اپنی شان میں گستاخی نہیں کر سکتا،

اپنے کوتنقید سے بلند اور دوسروں کو اپنے سے کمتر جانتا ہے، جس کی طبیعت میں ضبط نہیں، جس کا مزاج آسانی سے بھڑک اٹھتا ہے، جو اپنی دولت یا خاندان یا منصب کو نہ بھول سکے، خود بھی ان سے مرعوب رہے اور دوسروں پر بھی ان کا رعب ڈالنا چاہے، وہ جینے کے سلیقے سے بالکل نا آشنا ہے۔ اگر ہماری تعلیم خود پسندی اور خود پرستی کے ان بتوں کو نہ توڑے اور لوگوں کو خود پرستی کے ساتھ احتساب کرنا اور دوسروں کے ساتھ سمجھ داری اور نرمی کے ساتھ پیش آنا نہ سکھائے تو وہ زندگی کے لیے تیار نہیں کرسکتی۔ یہ انکسار اور خودشناسی کی صفت بھی زندگی کے گونا گوں نقشے میں ایک لطیف رنگ بھرتی ہے۔ بات صرف اتنی ہی نہیں کہ اخلاقی اعتبار سے ایک کُھلا دل، ایک فیّاض طبیعت، تنگ دلی سے بہتر ہے، بلکہ دوسرے لوگ جو سلوک ہم سے کرتے ہیں، وہ کبھی بڑی حد تک اس سلوک پر منحصر ہے جو ہم ان کے ساتھ کرتے ہیں۔ اگر ہم ان کے ساتھ دوستی، نیک نیتی اور بھروسے کے ساتھ پیش آئیں تو توقع ہوسکتی ہے کہ ان کا رویّہ بھی ہمارے ساتھ دوستانہ ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص جو میرے ساتھ اچھّا سلوک کرتا ہے، وہ دوسروں کے ساتھ بدسلوکی کرے۔ اگر وہ اس کے ساتھ شرافت سے پیش نہ آئیں۔ یعنی لوگ صرف سفید و سیاہ رنگ میں رنگے نہیں ہوتے کہ سب کے ساتھ اچھّے ثابت ہوں گے یا بُرے۔ دراصل دوسروں کی فطرت کی خوبیوں کو اُجاگر کرنا ایک حد تک خود ہمارے اختیار میں ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رہے کہ یک طرفہ نیکی کرنے میں بڑی برکت ہے، خواہ لوگ اس بات کو مانیں یا نہ مانیں، نیکی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اکثر بدی کے ہتھیار رکھوالیتی ہے۔ اگر ہم میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ جس بات کو نیک اور سچ سمجھتے ہیں، وہی کریں اور اس کی زیادہ فکر نہ کریں کہ دوسرے کیا کرتے ہیں، تو ہم دھیرے دھیرے اپنے مخالفوں کے دل کو جیت سکتے ہیں۔ نیکی بھی بدی کی طرح متعدّی ہے، اس کا اثر دور دور تک پھیلتا ہے۔ اگر ہم روزمرّہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں چھوٹی چھوٹی باتوں میں نیکی اور سچّائی

سے کام لیں، تو وہ آہستہ آہستہ ہماری ساری زندگی کے کاروبار میں راہ پا جاتی ہے اور جب کبھی کوئی ایسی نازک صورتِ حال پیش آتی ہے جہاں ہمیں خیر و شر کی ازلی جنگ میں حصّہ لینا پڑتا ہے اور اپنی تقدیر کو بنانے یا بگاڑنے والے فیصلے کرنے ہوں تو عمر بھر کی یہ عادتیں اور رجحان ہمارے کام آتے ہیں۔ اس طرح زندگی کے چھوٹے اور بڑے کاموں میں ایک نفسیاتی رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور بقول پیغمبرِ اسلامؐ کے ساری دنیا ایک 'مسجد' بن جاتی ہے، جہاں انسان ہر کام اس انداز سے کرتا ہے گویا وہ اپنے بنانے والے کے سامنے کھڑا عبادت کر رہا ہے۔ بہت مشکل ہے ایسی کیفیت پیدا کرنا اپنے دل و دماغ میں، لیکن یہ سب مذہبوں کی مشترک تعلیم ہے اور بہت سے مردانِ خدا نے بلکہ بہت سے نیک اور گمنام لوگوں نے بھی اس شان کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ اور پھر کیسی قوّت پیدا ہو جاتی ہے ایسے لوگوں میں کہ موت بھی انھیں زیر نہیں کر سکتی۔ ایک نظر سے دیکھیے تو انسان کی زندگی ایک ٹمٹماتے چراغ کی طرح ہے، جو چند لمحوں کے لیے روشن ہوتا ہے اور پھر موت کی ایک ہلکی سی پھونک اُسے بجھا دیتی ہے لیکن جب کوئی انسان اپنی زندگی کو بڑے مقاصد کے ساتھ وابستہ کر لیتا ہے اور ان کی قدروں کا حامل بن جاتا ہے اور انھیں روزمرّہ کی زندگی میں برتتا ہے، تو کوئی آندھی اس چراغ کو نہیں بجھا سکتی۔ موت اس کے جسم کو فنا کر دیتی ہے، لیکن اس کے دماغ کی جولانی، اس کے دل کا گداز، اس کی روح کی بلندی، اس کے مقصد کی تابانی قائم رہتی ہے اور تھکے ماندے، راستے سے بھٹکے مسافروں کی ہمّت بڑھاتی ہے۔ اس قسم کے چراغ جلانا ہر انسان کا فرض ہے اور چراغ کا کمال یہ ہے کہ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو، ساری دنیا کا اندھیرا بھی اسے نہیں بجھا سکتا۔ لیکن انسان کی شخصیت کو صرف فکر کی روشنی اور کام کی تپسیا ہی 'تاج محل' نہیں بناتی۔ اس کو جذبات کی دولت بھی ملی ہے جن کی صحیح تربیت کے بغیر اس کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے اس کی حُسن شناسی اور حُسن آفرینی کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا اور اس میں ذوقِ جمال کی شمع

جلانا ضروری ہے۔ خوبصورتی سے لطف اٹھانے کی صلاحیت قدرت کی ایک انمول دین ہے، جو زندگی میں مسرّت کا رنگ بھرتی ہے اور اس کو طرح طرح سے مالا مال کرتی ہے، خواہ وہ خوبصورتی عالمِ فطرت میں پائی جائے یا انسانوں کے خدوخال میں، یا علم اور حق کی تلاش میں یا آرٹ اور دستکاری کی تخلیق میں۔

خواجہ غلام السیّدین

مشق

لفظ و معنی

مشاہیر	:	مشہور کی جمع، یعنی مشہور لوگ
دل آویزی	:	دل کو کھینچنے کی صفت
محاسبہ کرنا	:	حساب کرنا، جائزہ لینا
ریاضت	:	محنت، جدوجہد
کیسہ	:	تھیلی
حقیر	:	بے وقعت
تکمیل	:	مکمّل کرنا، مکمّل ہونا
عطیہ	:	بخشش، انعام
منصور	:	ایک مشہور صوفی جنھیں ان کے خیالات کی وجہ سے سزائے موت دی گئی تھی
انا الحق	:	(عربی) میں مطلق حق ہوں، یعنی میں خدا ہوں

بدگوئی	:	بُرا کہنا
کلمۂ خیر	:	اچھّی بات
حسنِ ظن	:	نیک خیال، اچھّا خیال
اعتماد	:	یقین
تحقیر	:	کسی کو حقارت کی نظر سے دیکھنا، کم تر ٹھہرانا
منصب	:	عہدہ
گُوناگُوں	:	قسم قسم کے
اجاگر کرنا	:	روشن کرنا، ظاہر کرنا
متعدّی	:	کوئی چیز، مثلاً بیماری جو چھوت سے لگتی ہو
اَزل	:	ہمیشگی

غور کرنے کی بات

- جینے کا سلیقہ خواجہ غلام السیّدین کا بہت اچھّا مضمون ہے۔ اس میں مصنف نے صحیح معنوں میں زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھایا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی گزارنے کے لیے جہاں اچھّے لوگوں کی صحبت کی ضرورت ہوتی ہے وہاں کام کرنا بھی اچھّی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔
- دنیا میں جتنے بھی بڑے لوگ گزرے ہیں اگر آپ ان کی زندگی کے حالات پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر بڑے انسان کے پیچھے اس کے اچھے کام ہیں جنھوں نے اس کے نام کو زندہ رکھا ہے لیکن بڑا آدمی بننے کے لیے انسان کو بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. ڈاکٹر ذاکر حسین نے کام کی کیا اہمیت بتائی ہے؟

2. دل تنگی، بدنیتی اور شبہے کی ذہنیت کس طرح گھاٹے کا سودا ہے؟
3. مصنّف کی نظر میں کیسے لوگ جینے کے سلیقے سے نا آشنا ہیں؟
4. اچھّی گفتگو کے ذریعے ہم کس طرح کامیابی حاصل کر سکتے ہیں؟
5. مصنّف نے اس مضمون میں کیا سمجھانے کی کوشش کی ہے؟ مختصر لکھیے۔

عملی کام

- ''چراغ کا کمال یہ ہے کہ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو ساری دنیا کا اندھیرا اسے نہیں بجھا سکتا۔'' اسی طرح کے چند جملے جو آپ کو اچھّے لگے ہوں انھیں اپنی کاپی میں لکھیے اور زبانی یاد کیجیے۔
- اس مضمون میں ایک جگہ دو لفظ آئے ہیں با مقصد اور بے مقصد۔ ان الفاظ میں صرف 'بے' اور 'با' کے استعمال سے لفظ کے معنی ہی بدل گئے ہیں یعنی با مقصد جس کا کوئی مقصد ہو اور بے مقصد جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ آپ بھی ایسے چند الفاظ لکھیے جن میں 'بے' اور 'با' کا استعمال کیا گیا ہو۔
- مصنّف اپنی بات میں زور اور اثر پیدا کرنے کے لیے کبھی کبھی تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس مضمون میں بھی مصنّف نے ایک صوفی حضرت منصور حلاج کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے ایک خاص کیفیت میں 'انا الحق' (میں خدا ہوں) کہہ دیا تھا۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ وہ خدائی کا دعویٰ کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے بادشاہِ وقت نے انھیں سزائے موت دی تھی۔

  اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ مندرجہ ذیل تاریخی اشارات کے بارے میں اپنے استاد سے پوچھ کر لکھیے:

  قارون کا خزانہ، نمرود کی خدائی، حسنِ یوسف
- نیچے لکھے ہوئے الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے:

  تکمیل، عطیہ، منصب، اعتماد

انفارمیشن ٹیکنالوجی

(INFORMATION TECHNOLOGY)

انفارمیشن کا مطلب ہے اطلاعات۔ایک وقت تھا جب کہا جاتا تھا کہ ''جو جس قدر کم جانتا ہے اتنا ہی مزے میں ہے''،لیکن آج معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی جو جس قدر کم جانتا ہے اتنا ہی گھاٹے میں ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے جسے ''انفارمیشن ٹیکنالوجی'' کی صدی کہا جاتا ہے۔ یہاں زیادہ سے زیادہ جاننے والا ہی فائدے میں ہے۔اس کی وجہ انسانی نفسیات ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ انسان میں تجسّس کا مادہ ہے وہ ہر آن 'کچھ' 'کرنا' اور 'ہونا' چاہتا ہے۔اسی تجسّس نے ایسی ایسی ایجادات کرائیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں بھی ان پر غور کریں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ہم ایک باخبر اور ترقی یافتہ معاشرے میں سانس لے رہے ہیں۔ ہر پل ہر لمحہ کوئی نہ کوئی خبر یا اطلاع ہمیں ملتی رہتی ہے۔

ذرا غور کیجیے کہ ابتدائی انسان نے بے خبری یا لاعلمی کی زندگی کس طرح گزاری ہوگی۔ دیوانوں کی طرح اِدھر سے اُدھر دوڑتا پھرتا ہوگا۔اس کیفیت میں ذرا سی آہٹ،انسانی یا حیوانی چیخ اور دھماکے سے اس کے پورے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی ہوگی۔اس کی آنکھیں جن چیزوں کے دیکھنے کی عادی ہوگئی ہوں گی،اس کے کان جن آوازوں سے مانوس ہو چکے ہونگے،ان سے ہٹ کر جو کچھ نظر آیا ہوگا اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا ہوگا۔ جب پہلی مرتبہ ایک ڈھلان سے لڑھکتا ہوا گول پتھّر اس کے سامنے آیا تو اس کی حرکت اور رفتار نے اسے کچھ کرنے پر اُکسایا۔ پتھّر کے اس لڑھکنے، چلنے اور گھومنے کے عمل نے اسے سوچنے پر مجبور کیا اور پھر اسی واقعہ سے پہیّے کی ایجاد ہوئی اور انسان 'بے خبری' کی دنیا سے باہر آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انسان پتھر کے عہد سے

دست کاری اور پھر 'مشینی عہد' میں پہنچ گیا۔ طرح طرح کی ایجادات نے باخبر اور مہذّب معاشرہ میں رہنے کی تحریک دی۔ چنانچہ ہاتھ سے چلائی جانے والی مختلف کاموں کی مشینیں وجود میں آئیں۔ کاغذ اور چھپائی کی مشین (پرنٹنگ پریس) کی ایجاد نے انسان کو پوری دنیا سے باخبر رہنے اور اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا وسیلہ فراہم کیا۔ کتابیں، جرائد اور اخبارات نے خبروں کی فراہمی اور خبر رسانی کے مشکل عمل کو رفتہ رفتہ آسان سے آسان تر بنا دیا۔

انسان ہمیشہ سے خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہا ہے۔ اسی تلاش اور جستجو سے ٹیلی گراف، ٹیلی فون، وائرلیس، ریڈیو، ٹرانسسٹر، سیٹلائٹ، ٹیلکس، فیکس، کمپیوٹر، پیجر، کیبل، نیٹ ورک اور انٹرنیٹ جیسی ایجادات سامنے آئیں۔ اب اطلاعات، خبروں کی فراہمی اور خبر رسانی کا دنیا بھر میں ایک جال بچھ گیا ہے۔

1830ء میں ٹیلی گراف اور 1876ء میں ٹیلی فون کی ایجاد کے وقت موجدوں نے یہ تو ضرور سوچا ہوگا کہ ہماری ایجادات آئندہ زمانے میں اضافے اور تبدیلیوں کے ساتھ دنیا کی گراں قدر خدمت انجام دیں گی لیکن اُنھیں یہ خیال نہیں آیا ہوگا کہ سو ڈیڑھ سو برس بعد خبر یا پیغام رسانی کا ایک ایسا مضبوط اور مربوط نظام وجود میں آئے گا جو اس وسیع و عریض دنیا کو سمیٹ کر رکھ دے گا اور جسے انفارمیشن ٹیکنالوجی کا نام دیا جائے گا۔

آج گھر کے ایک گوشے میں میز پر رکھا ہوا ٹیلی ویژن یا کمپیوٹر ہمیں دنیا بھر کے معاملات سے ہر پل، باخبر کرتا رہتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کی بدولت 24 گھنٹے سات سمندر پار کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی خبریں، اطلاعات اور پیغامات پلک جھپکتے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پہنچ جاتی ہیں۔ فوری ترسیل کے اس عمل کو ''انفارمیشن ٹیکنالوجی'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس اطلاعاتی تکنیک کو ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر نے فروغ دیا۔ یعنی خبر جو پہلے کان کے پردے سے دماغ تک پہنچتی تھی اب اسکرین پر نظر آنے لگی۔ انسانی ذہن نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر کے اسکرین کو ایسے 'پَر' عطا کیے کہ دنوں کا فاصلہ لمحوں میں طے ہونے لگا۔ تیز رفتاری اور

بروقت عملِ ترسیل نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں(Global Village) بنادیا ہے۔

(i) ٹیلی ویژن (Television)

دنیا میں چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو ٹیلی ویژن سے واقف نہ ہوں۔ دن بھر میں اَن گنت بار یہ نام زبان پر آتا ہے۔ ٹیلی اور ویژن دو الگ الگ زبانوں کے لفظ ہیں 'ٹیلی' (Tele) یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں فاصلے سے یا دور سے۔ 'ویژن' لاطینی زبان سے لیا گیا ہے اس کے معنی ہیں دیکھنا یا نظر آنا۔ اس طرح ٹیلی ویژن کے مجموعی معنی ہوئے دور یا فاصلے سے دیکھنا یا نظر آنا— عام آدمی کے لیے سنیما بڑا پردہ (Big Screen) ہے اور ٹیلی ویژن چھوٹا پردہ (Small Screen) ہے لیکن ٹیلی ویژن کا یہ چھوٹا پردہ سنیما کے مقابلے میں زیادہ مؤثر اور مفید ہے۔ سنیما کی دنیا محدود ہے اور ٹیلی ویژن کی لامحدود۔ سنیما ہال میں مقررہ وقت میں ایک ہی فلم دن کے مختلف حصّوں میں دیکھ سکتے ہیں جبکہ ٹیلی ویژن کے ان گنت چینلوں میں ریموٹ کا بٹن دباتے ہی چینل بدل جاتا ہے، اسی طرح چینل بدل بدل کر تفریحی سیریز، مختلف موضوعات پر ترتیب دیے گئے پروگرام یا خبریں 24 گھنٹے دیکھ سکتے ہیں۔ تکنیک کے اعتبار سے ٹیلی ویژن، ریڈیو کی ایسی ترقی یافتہ شکل ہے جسے ہم سنتے ہی نہیں دیکھ بھی سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن آج کل زندگی کی ضرورت بن گیا ہے۔ اس کے متعدد چینلز خبروں اور معلومات سے بھرپور پروگرام پیش کرتے ہیں لیکن ایسے چینلز جو صرف سیریلز اور تفریحی پروگرام پیش کرتے ہیں اس کے اِفادی پہلو پر غالب آ گئے ہیں۔

(ii) کمپیوٹر (Computer)

اگلے وقتوں کی کہانیوں میں ایک کہانی 'الہ دین اور جادوئی چراغ' ہے۔ الہ دین جب جب اس چراغ کو رگڑتا تو ایک جن برآمد ہوتا اور کہتا ''کیا حکم ہے میرے آقا.......'' بیسویں صدی کی ایجاد کمپیوٹر بھی ایک جن کی طرح ہے جو ہر وقت انسانی احکام کا تابع نظر آتا ہے۔ کمپیوٹر ایسا مشینی

آلہ ہے جو عقل سے عاری ہے مگر عمل میں ہزاروں جنّوں پر بھاری ہے۔ کمپیوٹر الیکٹرونکس کی دین ہے جس نے ہماری زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ کمپیوٹر کا بنیادی مقصد ہر طرح کی معلومات کو یکجا کرنا اور انھیں ترتیب دینا ہے۔

لاطینی زبان کا ایک لفظ 'کمپیوٹیئر' ہے جس کے معنی ہیں اعداد و شمار (Data) کا حساب کتاب کرنا۔ یہی لاطینی لفظ اب کمپیوٹر کی شکل میں اس الیکٹرونک ایجاد کا نام ہے۔

(iii) انٹرنیٹ (Internet)

انٹرنیٹ کمپیوٹر کے کسی ایک عمل یا طریقۂ کار کا نام نہیں۔ انٹرنیٹ کا تعلق ایک سے زائد کمپیوٹروں سے ہے۔ جب ایک کمپیوٹر کو کسی دوسرے کمپیوٹر سے جوڑا جاتا ہے تو دونوں ایک دوسرے کی معلومات، اعداد و شمار اور پروگرام کی فائلیں ایک سے دوسرے میں منتقل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح دو سے تین اور تین سے چار اور اَن گنت کمپیوٹروں سے رابطے کا عمل نیٹ ورک کہلاتا ہے۔ نیٹ ورک چھوٹے پیمانے پر ایک دفتر یا ایک ادارے میں ہوسکتا ہے اسے لوکل ایریا نیٹ ورک کہتے ہیں، لیکن جب اسی نیٹ ورک کو وسیع پیمانے پر اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ پوری دنیا کے کمپیوٹر باہم مربوط ہو جائیں تو یہ طریقۂ کار 'وائڈ ایریا نیٹ ورک'' کہلاتا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ انٹرنیٹ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے نیٹ ورکس (Networks) کا نیٹ ورک (Network) ہے جس کے ذریعے پوری دنیا میں کمپیوٹر ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں۔ اس عالمی انٹرنیٹ کو ''انفارمیشن سپر ہائی وے'' (یعنی معلومات کی شاہراہ) کا نام دیا گیا ہے۔

انٹرنیٹ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ گھر بیٹھے دنیا بھر کی معلومات کم وقت اور کم خرچ میں حاصل ہوسکتی ہیں۔ اپنے کمپیوٹر نیٹ ورک کے ذریعے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے عزیز و اقارب سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ تعلیم، کاروبار، صحت اور بیماری سے متعلق مشورے دستیاب ہوسکتے ہیں۔ سفر اور طریقۂ سفر کے لیے انٹرنیٹ ایک رہبر کا کام انجام دیتا ہے۔ انٹرنیٹ کے وسیلے سے آپ دنیا

بھر سے نجی یا تجارتی اشیا کا آرڈر دے کر انھیں گھر بیٹھے حاصل کر سکتے ہیں۔ دنیا بھر کے اخبارات اور رسالوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

درحقیقت انٹرنیٹ نے دنیا کے مختلف حصّوں میں رہنے والے افراد کو ایک چھوٹی عالمی برادری میں بدل دیا ہے۔ اب ایک جیسی دلچسپی رکھنے والے انٹرنیٹ کے توسط سے بآسانی یکساں دلچسپی رکھنے والوں سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

(iv) ای - میل (Electronic Mail)

ای۔ میل الیکٹرانک میل کا مختصر نام ہے۔ اس سے مراد ہے برقی تاروں کے ذریعے پیغام رسانی۔ آپ دنیا کے کسی بھی حصّے میں پیغام یا اطلاع بھیجنے کے لیے ڈاک تار یا ٹیلی فون کا استعمال کرتے ہیں۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے اس پیغام رسانی کے کام کو آسان اور تیز رفتار بنا دیا ہے۔ آپ کے پاس کوئی بھی کمپیوٹر ہو اور وہ نیٹ ورک سے جڑا ہو تو آپ اپنا پیغام، اطلاع یا خبر کمپوز کریں۔ جب آپ کمپیوٹر کے ذریعے ای - میل بھیجتے ہیں تو یہ براہِ راست نہیں پہنچتا بلکہ آپ کا پیغام پہنچنے کے لیے متعلقہ شخص اور اس کے ای - میل کا پتہ کمپوز کیا جاتا ہے۔ آپ نے کسی ای - میل میں اس طرح دیکھا ہوگا۔ جیسے abc @ gel.net.in یہاں abc اس شخص یا ادارے کا نام ہے جسے ای - میل بھیجا گیا ہے @ علامت ہے ای - میل کی "gel" وہ ادارہ ہے جو ای - میل انٹرنیٹ سروس فراہم کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس ملک کا مختصر نام جہاں پیغام بھیجا جا رہا ہے۔ مثلاً انڈیا کے لیے In۔

ای - میل نہ تو ڈاک ہے نہ ہی ٹیلی فون کال۔ یہ ایک نیا مواصلاتی نظام ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ڈاک کے خطوں کے مقابلے میں انتہائی تیز رفتار اور سستا ہے۔ اس کے لیے پوسٹ مین کی آمد یا ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کا انتظار نہیں کرنا ہوتا۔ خط کھول کر کسی دوسرے شخص کے پڑھنے یا ڈاک کی گڑ بڑ یا دوسرے شخص کا فون سُننے کا خدشہ بھی نہیں ہوتا۔ آپ جسے

ای ۔ میل بھیج رہے ہیں وہ اپنے کمپیوٹر پر کسی بھی وقت ای ۔ میل کھول کر پڑھ سکتا ہے اور اسی طرح اگلے لمحے جواب دے سکتا ہے۔

''انفارمیشن ٹیکنالوجی'' بنیادی طور پر کمپیوٹر کی دین ہے۔کمپیوٹر، جس کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ ''اکیسویں صدی میں کمپیوٹر سے جو لوگ دور رہیں گے اُن کا شمار جاہلوں میں ہوگا۔''

مشق

لفظ و معنی

تجسّس	:	کھوج جاننے کی خواہش
سانحہ	:	صدمہ پہنچانے والا واقعہ، حادثہ
لاعلمی	:	بے خبری، کسی بات کا نہ جاننا
وسیلہ	:	ذریعہ، واسطہ، سبب
فراہم کرنا	:	اکٹھا کرنا
مُوجد	:	ایجاد کرنے والا
گراں قدر	:	انتہائی قیمتی
مربوط	:	باہم تعلق رکھنے والا (تحریر، خیال، بیان، چیزیں، جن میں آپسی تعلق ہو)
نظام	:	انتظام، بندوبست
مواصلات	:	ایک جگہ سے دوسری جگہ خبریں یا اطلاعات پہنچانا یا لے جانے کے ذرائع
اشتراک	:	ساجھا، حصّہ داری
اَحکام	:	حکم کی جمع
تابع	:	ماتحت، فرماں بردار، مطیع

عاری	:	خالی، یعنی کسی چیز کے نہ ہونے کی حالت
سازگار	:	موافق، مناسب، موزوں
نِکات	:	'نکتہ' کی جمع، باریک باتیں
نجی	:	ذاتی

غور کرنے کی بات

- اس مضمون کی ابتدا میں قدیم دور کے انسان کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ آج کے انسان کے مقابلے میں وہ کس قدر کم باتیں جانتا تھا۔ پہیّے کی ایجاد نے ایک انقلاب برپا کیا۔ پہیّے کی بدولت مشینیں ایجاد ہوئیں۔ پھر بجلی سامنے آئی تو مشینیں ہاتھ کے بجائے بجلی سے چلنے لگیں۔ اخبار، رسالے اور کتابیں شائع ہونے لگیں اور اس طرح ایک خطّے کا انسان زمین کے دوسرے خطے پر رہنے والے افراد سے واقف ہونے لگا۔ ان ایجادات نے انسان کو مزید غور و فکر اور خوب سے خوب تر کی تلاش پر آمادہ کیا۔ یہ ایجادات موجودہ مواصلاتی نظام کی پہلی سیڑھی ہیں۔
- انیسویں صدی میں صنعتی انقلاب کے بعد سائنس اور ٹکنالوجی کے ذریعے سائنس دانوں نے ایسے آلات ایجاد کیے جو کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام انجام دینے لگے۔ مثلاً تیز رفتار ریل گاڑیاں، کاریں، جہاز، راکٹ، خلائی مہمات میں کام آنے والے جہاز، اطلاعات فراہم کرنے والے ٹیلی گراف، ٹیلی فون وغیرہ۔
- بیسویں صدی میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر نے کائنات سے متعلق انسانی معلومات میں اضافہ کیا۔ خاص طور پر کمپیوٹر نے سوچنے کا ڈھنگ بدل دیا۔ یہ صحیح ہے کہ کمپیوٹر انسان کی طرح سوچنے اور غور کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا لیکن انسان سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے اپنا کام انجام دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک درمیانے سائز کا کمپیوٹر ایک سیکنڈ میں تقریباً

ایک ملین احکامات پر عمل کر سکتا ہے جبکہ اسی کام کو کرنے میں ایک انسان کو پورا ایک سال چاہیے۔اور وہ بھی دن رات اسی کام میں مصروف رہے تب۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. ابتدائی دور کے انسان کی زندگی کیسی تھی؟
2. آج کے عہد کو 'انفارمیشن ٹیکنالوجی کی صدی' کیوں کہا گیا ہے؟
3. ہماری زندگی میں ٹیلی ویژن کی کیا اہمیت ہے؟
4. کمپیوٹر نے ہماری زندگی کے ہر شعبہ کو کس طرح متاثر کیا ہے؟ تفصیل سے لکھیے۔
5. انٹرنیٹ کے کیا فائدے ہیں؟
6. ای - میل سے کیا مراد ہے؟

عملی کام

- انٹرنیٹ کی مدد سے اُردو شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں معلومات حاصل کیجیے۔
- 'انفارمیشن ٹیکنالوجی' کی ترقّی کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیے۔

ڈراما

ڈراما یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس سے مراد ہے 'کر کے دکھانا'۔ اس میں کرداروں، مکالموں اور مناظر کے ذریعے کسی کہانی کو پیش کیا جاتا ہے۔ قدیم ہندوستان میں بھی اس کی روایت موجود ہے اور اس کو 'ناٹیہ' کہا جاتا ہے۔

ارسطو نے ڈراما کو زندگی کی نمائندگی (Mimosis) کہا ہے۔ داستان، ناول اور افسانے کے مقابلے میں ڈراما اس لحاظ سے حقیقت سے قریب تر ہوتا ہے کہ اس میں الفاظ کے ساتھ ساتھ کردار، اُن کی بول چال اور زندگی کے مناظر بھی دیکھنے والوں کے سامنے آتے ہیں۔ کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کو مکالمے اور آواز کے اُتار چڑھاؤ کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ ڈراما بنیادی طور پر اسٹیج کی چیز ہے، لیکن ایسے بھی ڈرامے لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے ہیں جو صرف سُنانے اور پڑھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ریڈیو کی وجہ سے ڈراموں کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے اور ٹیلی وِیژن پر جس طرح کے پروگرام سب سے زیادہ پیش کیے جاتے ہیں، اُن کا تعلق بھی کسی نہ کسی طرح ڈرامے ہی کی صنف سے ہے۔

ارسطو نے ڈرامے کے اجزائے ترکیبی میں چھے چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ قصہ، کردار، مکالمہ، مرکزی خیال، سجاوٹ اور سنگیت۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر ڈرامے میں سنگیت یا موسیقی کا عنصر ہو۔ پلاٹ، کردار، مکالموں اور مرکزی خیال کا ہونا البتّہ ضروری ہے۔ ڈرامے کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں واقعات کی کڑیاں اس طرح ملائی جائیں کہ بتدریج نقطۂ عروج تک پہنچ سکیں اور ناظرین کی توّجہ ایک نکتے یا خیال پر مرکوز ہو جائے۔ اس کے بعد ڈراما انجام کی طرف بڑھتا ہے۔ واقعات سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے، وہ انجام کے ذریعے پیش کر دیا جاتا ہے۔ حق و باطل اور خیر و شر کی کش مکش، بنیادی انسانی اقدار اور سماجی، قومی اور سیاسی مسائل کو ڈراموں میں پیش کیا جاتا ہے۔

شوکت تھانوی

(1904ء – 1963ء)

شوکت تھانوی کا اصل نام محمد عمر تھا، وہ اردو کے مشہور مزاح نگار تھے۔ مزاحیہ تحریروں اور ناولوں کے علاوہ انھوں نے ریڈیو کے لیے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے قلم میں بلا کی روانی تھی۔ روزمرّہ کی باتوں اور آئے دن پیش آنے والے واقعات کو اس مزے سے بیان کرتے اور ان میں ایسے ایسے دلچسپ نُکتے پیدا کر دیتے تھے کہ پڑھنے والا بے اختیار ہنس پڑتا۔ وہ الفاظ کے استعمال اور جملوں سے بھی ہنسی پیدا کرتے تھے۔ وہ شوخی اور ظرافت کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھتے تھے کہ تحریر میں تہذیب سے گری ہوئی بات یا فقرہ نہ آنے پائے۔ ان کی جودتِ ذہن معمولی باتوں کو بھی دلچسپ بنا دیتی تھی۔

'سودیشی ریل'، 'موجِ تبسم'، 'طوفانِ تبسم'، 'شیش محل'، 'جوڑ توڑ'، 'کارٹون' اور 'قاضی جی' وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

شوکت تھانوی نے شاعری بھی کی ہے لیکن وہ مزاحیہ شاعری نہیں بلکہ سنجیدہ غزل کی شاعری ہے۔

خدا حافظ

(میر صاحب اپنے مصاحب اور تمام احباب میں بیٹھے ہوئے سفر کے متعلق تبادلۂ
خیالات کر رہے ہیں)

میر صاحب : اَماں تم ہی بتاؤ مرزا صاحب کہ اس ریل کے سفر میں نصیبِ دشمناں جان جوکھم تو نہیں ہے۔

مرزا صاحب : آپ کی بھی واللہ کیا باتیں ہیں۔یعنی میں کہہ تو رہا ہوں کہ اس ریل کے سفر میں سر کے بال سفید کر لیے ہیں۔پھر آپ کا یہ سفر تو قدم بھر کا ہے۔

میر صاحب : انشاء اللہ! مگر بھئی بات یہ ہے کہ یہ پہلا اتفاق ہے، اسی سے جی گھبراتا ہے۔اَماں تم بھی چلو نا ساتھ۔تم کو ذرا اس سفر کا تجربہ ہے اور میں بالکل نیا آدمی، تمہارے سرِ عزیز کی قسم کلیجا ہاتھوں اُچھلتا ہے۔

مرزا صاحب : اگر آپ کہتے ہیں تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔مگر آپ نے تو واللہ کمال کر دیا۔اس زمانے میں آپ ایسے بہت کم نکلیں گے جو ریل کے سفر سے ناواقف ہوں۔

میر صاحب : بھئی یقین جانو میں خاندانی وضع کے خلاف یہ بات کر رہا ہوں۔اللہ جنّت نصیب کرے۔ابّا جان مرحوم تو کبھی اس محلے سے باہر نہ نکلے تھے اور خدا بخشے دادا جان مرحوم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کبھی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلے۔ایک میں ہوں کہ دیس چھوڑ کر پردیس کی ٹھانی ہے۔

(دروازہ کُھلنے اور احباب کی آواز)

مرزا صاحب : لیجیے لیجیے شیخ صاحب بھی تشریف لے آئے۔

شیخ صاحب : (آگے آکر) آداب بجالاتا ہوں حضور والا۔

میر صاحب : تسلیمات عرض ہے بھائی صاحب! خوب تشریف لے آئے۔

شیخ صاحب : جی ہاں! ابھی سنا تھا کہ سواری کہیں سیر وسیّاحت کو جارہی ہے۔

میر صاحب : لو اور سنو، یہ سیر وسیّاحت ہے کہ آدمی دیس چھوڑ کر پردیس کا ہو جائے۔مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ جائداد کا مقدمہ ہے۔نہیں جاتا ہوں تو خاندانی جائداد جاتی ہے ورنہ بھائی تم جانتے ہو کہ ہمارے خاندان کو سفر سے کیا علاقہ؟

شیخ صاحب : بجا فرماتے ہیں آپ، بے شک تشریف لے جانا نہایت ضروری ہے۔

مرزا صاحب : بھائی صاحب ہمارے میر صاحب ریل کے سفر سے سخت پریشان ہیں۔ آپ ہی کچھ سمجھایئے۔

میر صاحب : میں پریشان ہوں البتّہ پہلا اتّفاق ہے اور سواری بھی وہ ایسی جس کی نہ لگام نہ جس پر چابک کا اثر اور سُنا ہے پھر بھی وہ ہوا سے باتیں کرتی ہے۔

شیخ صاحب : اے جناب اس میں ذرا بھی تشویش کی بات نہیں۔ میں خود برابر سفر کرتا رہتا ہوں۔نہایت آرام کی سواری ہے۔

مرزا صاحب : میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا لیکن آپ کو اطمینان نہیں ہوتا اور مجھ کو بھی ساتھ لیے جاتے ہیں۔

میر صاحب : تو کیا شیخ صاحب قبلہ کو میں چھوڑ دوں گا؟

شیخ صاحب : نہیں حضرت میں تو معافی چاہوں گا آج کل گھر میں ذرا علیل ہیں اور خود مجھ کو بھی صبح سے چھینکیں آرہی ہیں۔

میر صاحب : یہ تو واللہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم پردیس کو سدھاریں اور ہمارے احباب دیس میں رہیں۔آپ کو تو میں چھوڑ ہی نہیں سکتا۔

مرزا صاحب : بھائی صاحب آپ نے کبھی میر صاحب قبلہ کی کسی بات میں کوئی عُذر نہیں کیا۔

شیخ صاحب : میں اور عُذر کروں استغفر اللہ۔ میں تو صرف اجازت چاہتا ہوں۔ وہ بھی اگر منظور نہیں ہے تو جو حکم ہو، بندہ حاضر ہے۔

میر صاحب : بس تو صاحب آپ فوراً گھر تشریف لے جا کر الٹے پیروں واپس آ جایئے۔ اس لیے کہ اب وقت کم ہے۔

شیخ صاحب : گاڑی چار بجے جاتی ہے اور ابھی ایک ہی تو بجا ہے۔

میر صاحب : یہ درست ہے مگر کیا اعتبار اس بے لگام گھوڑے کی گاڑی کا اور جو پہلے چل دے۔

مرزا صاحب : جی نہیں ایسا نہیں ہوسکتا مگر احتیاط اچھّی چیز ہے۔ اگر گھنٹہ دو گھنٹے پہلے اسٹیشن پر پہنچ جائیں تو اچھّا ہے۔

شیخ صاحب : تو میں اجازت چاہتا ہوں۔ ابھی ذرا حاضر ہوا۔

میر صاحب : بسم اللہ، مگر چشم براہ ہوں۔

شیخ صاحب : میں ابھی حاضر ہوا۔ بس گیا اور آیا (جاتا ہے)

(پیروں کی چاپ، دروازے کی آواز، دولت آتا ہے۔)

میر صاحب : کیوں دولت کیا ہے؟

دولت : سرکار بستر میں تکیے، تکنیاں، توشک، چادر، شال۔ پلنگ پوش رکھ دیا ہے اور کچھ تو نہ رکھا جائے گا؟

میر صاحب : اور لحاف۔

مرزا صاحب : ایں یعنی اس گرمی میں لحاف بھی لے جایئے گا۔

میر صاحب : بھائی پردیس کا معاملہ ہے۔ معلوم نہیں وہاں کا موسم کیسا ہو۔

مرزا صاحب : چار قدم پر وہ جگہ جہاں آپ تشریف لے جا رہے ہیں۔ وہاں کا موسم وہی ہے جو یہاں کا۔

میرصاحب : پھر بھی اگر لحاف رکھ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے اور ہاں مچھر دانی بھی بستر میں رکھ دینا۔

دولت : سرکار مچھر دانی کے بانس بھی۔

میرصاحب : بانس ہیں تو ضروری مگر کیوں بھئی مرزا صاحب! بانسوں میں ذرا طوالت ہے۔

مرزاصاحب : اجی بانس وانس نہیں جو دیکھے گا ہنسے گا۔

میرصاحب : اچھا بانس نہ رکھو مگر دیکھو ایک آدھ قالین اور ایک آدھ گاؤ تکیہ کہیں علاحدہ ضرور باندھ لینا۔

مرزاصاحب : یہ سب کیا ہوگا؟

میرصاحب : یعنی کیا وہاں بیٹھنے وٹھنے کی ضرورت نہ ہوگی؟

مرزاصاحب : دن بھر کا قیام ہے اور ایک رات گزار کر واپسی کا ارادہ ہے۔ اس کے لیے یہ سب جھگڑا۔

میرصاحب : تو آخر بے سروسامانی کے سفر سے کیا حاصل؟

مرزاصاحب : بہتر ہے اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو مناسب ہے۔

دولت : سرکار کوئی اور چیز؟

میرصاحب : کپڑوں کے دونوں بکس، لوٹے، طشت، اُبٹن دانی، صابن دانی، منجن دانی، تولیے، چائے کے لیے پتیلی، گلاس، تھالیاں، انگیٹھی، کوئلوں کا تھیلا، چائے کے سب برتن وغیرہ رکھ لیے ہیں۔

مرزاصاحب : خدا کی پناہ! آخر اتنا سامان۔

میرصاحب : بھائی پردیس کا معاملہ ہے کیا گھر سے یونہی چل دیا جائے۔

(دروازہ کھلتا ہے، رونق ملازمہ آتی ہے۔)

میرصاحب : کیا ہے رونق؟

رونق : اللہ سلامتی رکھے۔

میر صاحب : اری نیک بخت، یہ کشتی میں کیا لائی ہے؟

رونق : قربان جاؤں سرکار۔ یہ بڑی بیگم کے یہاں سے گلوریاں، پھول اور امام ضامن بھیجے ہیں۔

میر صاحب : اچھّا اچھّا رکھو اور بڑی بیگم کو سلام کہلا دو۔

رونق : سرکار ابھی تو اور کشتیاں بھی ہیں۔

میر صاحب : یعنی اور ہیں ابھی؟

رونق : جی ہاں سرکار۔ اللہ رکھے سردار دلہن، بہو بیگم، شمشاد بیگم، نور محل، قمر دلہن سب ہی نے تو امام ضامن بھیجے ہیں۔

میر صاحب : خوب خوب لاؤ بھئی، وہ کشتیاں بھی لے آؤ۔

رونق : اور اللہ سلامتی رکھے، بہو بیگم اور قمر دلہن نے ناشتہ بھی بھیجا ہے۔

میر صاحب : اس تکلّف کی آخر کیا ضرورت تھی خیر ناشتہ تو دولت کو دے دے اور کشتیاں یہاں لے آ۔

رونق : اور سرکار بیگم صاحب نے کہا ہے کہ زری محل میں بھی تشریف لے آئیں۔

میر صاحب : اچھّا تو چل، میں آتا ہوں۔

(رونق چلی جاتی ہے۔)

میر صاحب : کیوں بھئی مرزا تو میں ہو آؤں ذرا محل میں؟

مرزا صاحب : بسم اللہ ضرور تشریف لے جائیں اور میرا آداب بھی عرض کریں بیگم صاحب سے۔ میں جب تک ذرا گھر سے ہو آؤں۔

میر صاحب : نہیں بھائی صاحب یہ نہیں ہو سکتا گاڑی کا وقت قریب ہے۔

مرزا صاحب : حضرت میں ابھی حاضر ہوا۔ غریب خانہ کون سا دُور ہے۔

میر صاحب : مگر بھئی جلدی آنا۔

مرزا صاحب : میں ابھی الٹے پیروں واپس آیا۔

(مرزا صاحب جاتے ہیں پیروں کی چاپ اور دروازے کی آواز سنائی دیتی ہے۔)

میر صاحب : اچھا میں ذرا ہو ہی آؤں محل میں۔

(دروازہ کُھلتا ہے بیگم آتی ہیں۔)

بیگم : اے میں کہتی ہوں سدھارنے کا وقت آ گیا اور باہر سے آنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔

میر صاحب : نہیں تو بیگم، میں تو بس آ ہی رہا تھا۔ ذرا مرزا صاحب اور شیخ صاحب کو ساتھ لے جانے کے لیے تیار کر رہا تھا۔

بیگم : تو وہ تیار ہو گئے۔ چلو اچھّا ہوا، دل بھی بہلے گا اور اکیلے بھی نہ رہو گے۔

میر صاحب : ہاں صاحب! بڑا اطمینان ہو گیا۔ پردیس کا معاملہ ہے ایک سے دو بھلے۔

بیگم : مگر میرا جی لگا رہے گا، جاتے ہی خط ڈال دینا۔

میر صاحب : بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔

بیگم : اچھّا جیسے آج میل سے گئے تو کب پہنچو گے؟

میر صاحب : آج ہی بس چھے بجے۔

بیگم : چلو ہٹو، چلے ہیں مجھ سے مذاق کرنے۔ چالیس کوس کا سفر ہے اور آج ہی پہنچ جائیں گے بے چارے۔

میر صاحب : تمھارے سرِ عزیز کی قسم۔ بس دو گھنٹے بلکہ اس سے بھی کم میں پہنچ جائیں گے۔

بیگم : آخر اتنا تیز جانے کی کیا ضرورت ہے کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آدمی جائے۔

میر صاحب : بھئی تو اس کو میں کیا کروں، کہتے ہیں کہ ریل اتنی ہی تیز چلتی ہے بیگم!

بیگم : اے ہے مجھے تو ہول ہو جائے گی۔

(دروازے پر دستک)

شیخ صاحب : (باہر سے) جناب میر قبلہ صاحب، اب ذرا جلدی کیجیے۔ وقت قریب ہے۔

میر صاحب : بہت بہتر، میں تو آپ کا ہی منتظر تھا۔ ابھی آیا۔

بیگم : اے تو لاؤ میں امام ضامن باندھ دوں اور ذرا سا دہی چکھ لو۔ اللہ اصل خیر سے واپس لائے۔

رونق : سرکار دہی مچھلی۔

بیگم : رونق ذرا کشتیاں اُٹھا میں امام ضامن باندھ دوں۔

میر صاحب : ہاں! تو ذرا جلدی کرو بیگم وقت کم ہے۔

بیگم : اے ایسی بھی کیا جلدی کہ ہاتھ پاؤں پھول جائیں۔ تم ہی تو اب تک بیٹھے رہے۔

رونق : لیجیے سرکار یہ بڑی بیگم کے یہاں کی کشتی ہے۔

میر صاحب : ارے صاحب جلدی جلدی۔

بیگم : رونق پہلے ہار اُٹھاؤ۔

رونق : لیجیے۔

بیگم : بسم اللہ (پہناتی ہے) لاؤ امام ضامن بھی باندھ دوں۔

رونق : لیجیے سرکار۔

بیگم : (باندھ کر) امام ضامن کی ضامنی۔

میر صاحب : اور بھی سب جلدی جلدی سے باندھ دو دیر ہو رہی ہے۔

بیگم : پھر تم نے ہاتھ پیر پھلائے، لا رونق اور کشتیاں جلدی جلدی اٹھا۔

رونق : لیجیے۔ لیجیے۔ لیجیے۔

بیگم : بسم اللہ۔ اے ہے یہ بہو بیگم کا کارچوب والا امام ضامن کیسا پیارا ہے۔

رونق : سرکار یہ شمشاد دلہن کے ہاں کا ہار دیکھیے گوٹے کا ہے اور امام ضامن بھی اچھا ہے۔

بیگم : سردار دلہن کو تو دیکھو۔ یہ اکیلا سلک کا امام ضامن بھیجا ہے اور یہ اس میں پیسہ بندھا ہے۔

رونق : نہیں سرکار اشرفی ہے یا شاید اُٹھنّی ہو۔

بیگم : ہاں یہ ہے امام ضامن۔ سردار دلہن دیکھیں تو دیکھتی رہ جائیں کیا کہنا ہے قمر دلہن کا۔

میر صاحب : بس صاحب ہو گئے سب امام ضامن۔

بیگم : اے میرا امام ضامن تو بندھوا لو۔

میر صاحب : ہاں صاحب وہ بھی زیادہ ضروری ہے اور ہاں بیگم ایک ایک امام ضامن مرزا صاحب اور شیخ صاحب کو بھی بھجوا دو۔

بیگم : اب چلے یہ چونچلے لے کر۔ میں اب کہاں سے لاؤں امام ضامن۔

میر صاحب : ارے صاحب کسی کپڑے میں ایک ایک روپیہ باندھ دو بس۔

بیگم : اچھّا میں ابھی بھیجتی ہوں۔

میر صاحب : اچھّا خدا حافظ۔

بیگم : اللہ کی امان امام ضامن کی ضامنی دہی مچھلی۔

رونق : میاں دہی مچھلی۔

میر صاحب : اب تم لوگ ذرا ہٹ جاؤ۔

شیخ صاحب : (باہر سے) اجی حضرت تشریف لائیے۔

میر صاحب : بھائی اندر آ جاؤ میں تیار ہوں۔

(دروازے سے شیخ صاحب اور مرزا صاحب آتے ہیں۔ چاپ)

شیخ صاحب : خیر خدا خدا کر کے آپ تیار تو ہوئے۔

مرزا صاحب : اور ذرا شان تو دیکھیے معلوم ہوتا ہے دولھا میاں چلے آ رہے ہیں۔

شیخ صاحب : خیر دولھا نہ سہی، حاجی صاحب تو ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ ان ہاروں اور امام ضامنوں میں۔

میر صاحب : بھئی کیا بتاؤں عورتیں جو چاہیں بنا دیں۔

شیخ صاحب : اچھا تو اب بگھّی منگوایئے نا ایک گھنٹہ باقی رہ گیا ہے۔

میر صاحب : دولت! ارے دولت!

(دولت آتا ہے)

دولت : سرکار۔

میر صاحب : دولت۔ سب سامان تیار ہے؟

دولت : جی ہاں! تیار ہے کل تیس عدد ہیں۔

میر صاحب : تاش کی گڈّی، چوسر، شطرنج، یہ سب رکھ لیا ہے۔

دولت : جی ہاں سرکار یہ سب چیزیں ہیں مگر...

میر صاحب : مگر کیا؟ کچھ بھول گئے! تمھارے دماغ میں بھوسا بھرا ہے۔

دولت : میں نے کہا سرکار، بٹیریں حضور کو یاد کریں گی۔

میر صاحب : بٹیریں! خوب یاد دلایا، بھئی ان کے کابک ساتھ لے لو، ورنہ واقعی ہڑک جائیں گی۔

دولت : بہت اچھا سرکار، لو اب بتّیس عدد ہیں۔

میر صاحب : کوئی پروا نہیں، تم اب دو بگھیاں فوراً لے آؤ۔

دولت : بہت اچھّا سرکار۔

(جاتا ہے)

(دروازہ کھلتا ہے، رونق آتی ہے۔)

رونق : سرکار بیگم صاحب نے مرزا صاحب اور شیخ صاحب کے لیے امام ضامن

بھیجے ہیں اور یہ ہار، اور کہا ہے کہ جب سے مٹھّو بیٹے کو آپ کے سدھارنے کی خبر ہوئی ہے برابر ٹیں ٹیں کر رہا ہے۔

میر صاحب : ارے بھئی یہ تو بڑی مصیبت ہے۔ واقعی مٹھّو بیٹے تو سخت پریشان کریں گے سب کو۔

رونق : اے سرکار وہ تو اگر ذرا دیر بھی سرکار کو نہ دیکھے تو آفت مچا دیتا ہے۔

میر صاحب : کیا رائے ہے مرزا صاحب۔ جہاں اتنا سامان ہوا وہاں ایک پنجرہ اور سہی۔

مرزا صاحب : جو رائے عالی ہو مگر اتنے سامان کا تو محصول پڑ جائے گا۔

میر صاحب : تو بھئی تم ہی بتاؤ کون سی چیز ضرورت سے زیادہ ہے۔ بغیر پان دان کے کام نہیں چل سکتا۔ بغیر ناشتے دان کے کیسے چل سکتا ہے اور اسی طرح سب چیزیں ضروری ہیں۔

شیخ صاحب : واللہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ولایت کا سفر ہے۔

مرزا صاحب : اور کیا جتنے آدمی ولایت جاتے ہیں وہ سب طوطے کا پنجرہ اور بٹیر کا کابک لے جاتے ہیں۔

میر صاحب : تو بھئی میں ان بے زبانوں کی جان تو لوں گا نہیں، چاہے کچھ بھی ہو۔

شیخ صاحب : نہیں صاحب۔ ہرگز نہیں۔ بہر حال اب سامان نکلوانا چاہیے۔ بگھّیاں آتی ہی ہوں گی۔

میر صاحب : آپ کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے دولت آتا ہی ہوگا۔

مرزا صاحب : اپنا کام کرنے میں بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ آپ نے ایک ہی کہی۔ واللہ ہے کہ میں سامان نکالتا ہوں۔

میر صاحب : اَماں تمھیں میری قسم جو سامان اٹھاؤ۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔

(دروازہ کھلتا ہے)

دولت : سرکار بگھیاں حاضر ہیں۔ ایک ایک روپے میں آئی ہیں۔

میر صاحب : اچھّا تو بھئی مرزا میں ایک مرتبہ ذرا گھر میں ہو آؤں۔

شیخ صاحب : بس تو پھر گاڑی مل چکی۔

میر صاحب : اماں ابھی آیا میں۔ بس سامان رکھا گیا کہ میں آ گیا۔

مرزا صاحب : ہاں ہاں آپ ضرور ہو آئیں، مگر ذرا جلدی کیجیے۔

میر صاحب : بس میں ابھی آیا تم سامان رکھواور۔

(جاتے ہیں)

مرزا صاحب : دیکھو دولت کوئی چیز نہ رہ جائے۔

دولت : کیا مجال ہے سرکار۔ مگر ایک بگھّی میں تو سامان ہی آئے گا۔

مرزا صاحب : بس تو ایک میں ہم سب آ جائیں گے۔

شیخ صاحب : مگر یار طوطے کا پنجرا اور بٹیروں کے کابک میر صاحب کے پاس ہی رکھنا۔

مرزا صاحب : ہاں یہ بھی اچھی دل لگی رہے گی۔

(دروازہ کھلتا ہے)

میر صاحب : لیجیے جناب میں آ گیا۔

مرزا صاحب : بس تو بسم اللہ کیجیے (دولت کو چھینک آتی ہے۔)

میر صاحب : یہ کون تھا؟ دولت نا! لاحول ولا قوۃ۔ آؤ بھئی مرزا ذرا بیٹھ جاؤ شگون خراب ہو گیا۔ ایک ایک پان کھا لو پھر چلیں گے۔ اس بدتمیز دولت کو دیکھو کہ اس وقت بدشگونی سوجھی تھی۔

شیخ صاحب : اچھّا خیر ایک ایک پان کھا لیجیے۔

دولت : سرکار پان حاضر ہے۔

میر صاحب : لو بھئی پان کھا لو (سب پان کھاتے ہیں) اب اٹھو۔

شیخ صاحب : بسم اللہ۔

مرزا صاحب : الا اللہ۔

میر صاحب : چل دولت باہر سے سب کو ہٹا دے۔

دولت : حضور باہر کوئی نہیں، تشریف لے چلیں۔

(سب چلتے ہیں۔ بلّی کی آواز آتی ہے سب رک جاتے ہیں۔)

میر صاحب : ہا! کمبخت راستہ کاٹ گئی۔

مرزا صاحب : یہ تو بہت بُرا ہوا کہ راستہ کاٹ گئی۔

میر صاحب : بس تار دیا جائے، کہ گاڑی چھوٹ گئی۔

شیخ صاحب : قبلۂ عالم یہ بھی خبر ہے کہ جہاں آپ کو جانا ہے وہاں دن بھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو ہر گھنٹے پر گاڑی چھوٹتی ہے۔

میر صاحب : اماں تو کچھ اور سوچو۔

شیخ صاحب : تو آخر اس میں کیا مضائقہ ہے کہ آپ اب دوسری گاڑی سے چلیں۔

میر صاحب : بھائی اب بیگم ہرگز نہ جانے دیں گی۔

شیخ صاحب : تو یہ سمجھ لیجیے جائداد کا معاملہ ہے کہیں خدانخواستہ کھٹائی میں نہ پڑ جائے۔

میر صاحب : کیا عرض کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

(رونق آتی ہے)

رونق : سرکار بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ اب کچھ بھی ہو جائے میں ہرگز نہ جانے دوں گی۔

میر صاحب : ارے صاحب تو میں کہاں جا رہا ہوں۔

مرزا صاحب : تو اب فرمایئے کس مضمون کا تار دیا جائے۔

میر صاحب : میرے خیال میں تو یہی تار دو کہ مجبوراً سفر ملتوی کر دیا۔

شیخ صاحب : جناب والا اس کا اثر مقدمے پر کیا پڑے گا؟

مرزاصاحب : مگر بھئی مجبوری کی وجہ سے سفر ملتوی کیا ہے نا۔

شیخ صاحب : کیا مجبوری ہے یہی نا کہ چند وہم گھیرے ہوئے ہیں۔

میر صاحب : لوٹ آؤ بھائی شیخ صاحب، یہ شگون نہایت منحوس ہوتا ہے۔

(دروازہ کھلتا ہے رونق آتی ہے۔)

رونق : سرکار بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ بلّی راستہ کاٹ گئی ہے۔ اب میں ہرگز نہ جانے دوں گی۔

میر صاحب : ہے تو واقعی یہ بہت برا، مگر مقدمے کا کیا ہوگا؟

رونق : سرکار جائداد آپ پر سے صدقے کی، مگر جب بلّی راستہ کاٹ جائے تو جانا نہیں چاہیے۔

میر صاحب : واقعی اب تو میرے قدم بھی نہیں اٹھتے۔

شیخ صاحب : حضرت یہ سب وہم ہیں۔

میر صاحب : ایں بھئی شیخ یہ کیا کہہ رہے ہو۔ اَماں یہ کیا کہہ رہے ہو، یعنی بلّی راستہ کاٹ جائے اور تم اس کو معمولی بات سمجھو۔

مرزاصاحب : نہیں صاحب یہ کوئی بات نہیں ہے۔ ایسی حالت میں سفر ہرگز نہیں ہوسکتا۔

میر صاحب : بھائی شیخ صاحب میں تم سے سچ کہتا ہوں تمھارے سرِ عزیز کی قسم ابّا جان مرحوم کے ایک دوست گھوڑے پر سوار تھے اور جنگل کا راستہ تھا کہ بلّی راستہ کاٹ گئی بس پھر نہ پوچھو گھوڑے کا ایک قدم آگے بڑھنا ہی تھا کہ اس نے ٹھوکر لی اور سوار سر کے بل گرا۔

مرزاصاحب : اے ہے بڑی چوٹ آئی ہوگی۔ جناب۔

میر صاحب : اَماں چوٹ! یقین جانو کہ تمام پیشانی لہولہان ہوگئی۔

شیخ صاحب : اتفاقاً ہوگیا ایسا، یہ کیا ضروری ہے کہ ہر مرتبہ ایسا ہی ہو۔

رونق : اے واہ میاں اللہ نہ کرے ایسا ہو میرا تو سن کر کلیجہ ہی دھڑک رہا ہے۔

میر صاحب : بھئی شیخ صاحب بعض وقت تو تم نہایت ناسمجھی کی باتیں کرتے ہو، گویا یہ شگون اور بدشگونی کوئی چیز ہی نہیں۔

شیخ صاحب : صاحب میں تو ان باتوں کو مہمل سمجھتا ہوں۔

مرزا صاحب : بھائی صاحب یہ تو نہ کہیے۔ البتہ یہ کہیے کہ آپ کچھ نئی روشنی کے آدمی ہو کر رہ گئے ہیں۔

میر صاحب : اَماں تمھیں میری قسم۔ ذرا دیکھو تو شیخ صاحب کی ڈھٹائی کہ بلّی راستہ کاٹ جائے اور یہ شیر ڈٹا رہے۔

مرزا صاحب : خیر سفر تو میری ناچیز رائے میں مناسب نہیں ہے البتہ خیال ہے تو صرف یہ کہ مقدمے کا کیا ہوگا۔

رونق : اے میاں چولھے میں گیا مقدمہ، اللہ جان سلامتی رکھے تو ایسے ایسے سیکڑوں مقدمے ہوں گے۔

میر صاحب : بھئی واللہ یہ بھی ایک ہی رہی۔ اَماں سنتے ہو مرزا کی رونق کی دعا کہ ایسے ایسے سیکڑوں مقدمے میرے لیے مانگ رہی ہیں۔

رونق : اے توبہ قربان جاؤں مجھے کیا معلوم۔

میر صاحب : تو بھئی مرزا اب تم ہی بتاؤ اس مقدمے کا کیا کیا جائے۔

مرزا صاحب : حضرت میری عقل خود حیران ہے۔

(دروازہ کھلتا ہے، دولت آتا ہے)

دولت : سرکار تو کیا سامان اتار لیا جائے۔

میر صاحب : سامان تو خیر ضرور اترے گا خواہ مقدمہ رہے یا جائے۔

دولت : تو سرکار بگھی والوں کو تو کرایہ دینا ہی پڑے گا۔

میر صاحب : ہاں ہاں تو کس نے کہا ہے کہ نہ دو۔

مرزا صاحب : میری ناقص رائے میں تو حاکم کو تار دے دیا جائے۔

میر صاحب : آخر کیا تار دیا جائے؟

شیخ صاحب : یہی کہ بلّی راستہ کاٹ گئی اور ملازم کو چھینک آ گئی۔

میر صاحب : بھئی شیخ صاحب، تم واللہ ہے کہ ان باتوں کو پھر وہم کہہ رہے ہو۔ یعنی بلّی راستہ کاٹ جائے اور وہم۔

مرزا صاحب : نہیں صاحب نہیں یہ وہم نہیں بلکہ واقعی احتیاط شرط ہے۔ آخر ہمارے بزرگ کیا کرتے تھے۔

میر صاحب : میں آپ سے عرض کروں کہ ہمارے بزرگ تو ان ہی خیالات کی وجہ سے سفر کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

(دروازہ کھلتا ہے دولت آتا ہے)

دولت : سرکار سرکار غضب ہو گیا۔ ایک بگھّی کا گھوڑا بھاگا بھاگا پھر رہا ہے مع تمام سامان کے اور بٹیروں کا کابک بھی اسی بگھّی پر ہے۔

(مرزا صاحب اور شیخ صاحب دروازہ کی طرف لپکتے ہیں۔)

میر صاحب : الٰہی خیر! خدا میری بٹیروں کو حفظ و امان میں رکھے۔ ذرا جلدی دیکھو بھئی۔ اَماں ذرا جلدی جاؤ تو۔

رونق : وہ تو مواشگون ہی خراب ہو گیا تھا۔ اس موئے نکٹے دولت کو بھی اسی وقت چھینک آنا تھا۔

دولت : ذرا زبان سنبھالے ہوئے۔ نکٹا میں کیوں ہوتا جو کہے وہ خود اس کی سات پُشت۔

رونق : دیکھیے سرکار یہ موا منھ بھر بھر کر میری پشتوں کو کہہ رہا ہے۔

میر صاحب : یہ لڑائی کا وقت نہیں ہے خدا کو یاد کرو۔

رونق : سرکار۔

دولت : سرکار۔

میر صاحب : چپ رہو سب چپ رہو۔

رونق : سرکار دیکھیے نا یہ موا۔

میر صاحب : خدا کو یاد کرو، میری بٹیریں اس وقت سخت مصیبت میں ہیں۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ شیخ صاحب اور مرزا صاحب داخل ہوتے ہیں۔)

مرزا صاحب : لیجیے حضرت اپنی بٹیریں، میں نے جاتے ہی گھوڑے کو پکڑ لیا۔

میر صاحب : بھئی واللہ کمال کیا۔ اماں ذرا دیکھو تو بٹیروں کے دل کیسے دھڑک رہے ہیں مگر واللہ ہے کہ خدا نے ہم لوگوں کو کیسا بچایا شکر ہے، ہم بگھی پر سوار نہ تھے۔

شیخ صاحب : صرف آپ کی صراحی گر پڑی ہے باقی سب خیریت ہے۔

میر صاحب : خیر بھئی صراحی گر گئی تو، جائے۔ سب کی جانوں کا صدقہ اُترا۔

مرزا صاحب : ہاں صاحب، رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت۔

شیخ صاحب : لاحول ولاقوۃ کیا ہنگامہ ہوا ہے بیٹھے بٹھائے۔

میر صاحب : ایسا ویسا ہنگامہ، ذرا میرا کلیجہ تو دیکھو کہ اب تک بے قابو ہے۔ دولت ذرا شربتِ انار تیار کرا اور بھئی مرزا میں ذرا محل میں ہو آؤں تا کہ بیگم کو اطمینان ہو۔

مرزا صاحب : تو ہم لوگ اجازت چاہتے ہیں۔

میر صاحب : اچھا بھئی خدا حافظ۔

شیخ صاحب : آداب بجالاتا ہوں۔

مرزا صاحب : تسلیمات عرض کرتا ہوں۔

میر صاحب : خدا حافظ۔ خدا حافظ۔

(پیروں کی چاپ دور جاتی سنائی دیتی ہے۔)

شوکت تھانوی

مشق

لفظ و معنی

لفظ	معنی
عُذر	بہانہ، کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی جو وجہ بیان کی جائے (جو جھوٹی بھی ہوسکتی ہے) اسے عُذر کہتے ہیں۔
تبادلۂ خیال	کسی موضوع پر دو یا زیادہ اشخاص کی باہمی گفتگو
خاندانی وضع	خاندانی طور طریقے
سیاحت	ملکوں کی سیر
چشم براہ	بہت شدید انتظار کرنے والا
مضائقہ	حرج، قباحت
طوالت	لمبائی، (محاورتاً مشکل)
غریب خانہ	انکسار کے ساتھ اپنے گھر کے لیے کہا جاتا ہے۔
امام ضامن	وہ روپیہ یا سکّہ جو مسافر کے بازو پر حفاظت سے پہنچنے کے خیال سے امام ضامن (امام موسیٰ رضا) کے نام پر باندھا جاتا ہے اور سفر ختم ہونے پر اسے خیرات کردیا جاتا ہے۔
محصول	ٹیکس، لگان
ملتوی کرنا	کسی کام کو جس وقت ہونا ہے اس وقت اسے نہ کرنے کا فیصلہ کرنا
لہولہان	خون میں لتھڑا ہوا

مہمل	:	بے معنی
ناقص	:	کھوٹا،عیب دار
رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت	:	(فارسی) ایک مصیبت آئی تھی لیکن خیریت کے ساتھ ٹل گئی

غور کرنے کی بات

- شوکت تھانوی روزمرہ کی باتوں کو بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں اور اس میں ایسے دلچسپ نکتے پیدا کرتے ہیں کہ قاری بغیر ہنسے نہیں رہ سکتا۔ 'خدا حافظ' ڈراما اس کی بہترین مثال ہے۔ اس میں زوال آمادہ تہذیب اور نوابین کی معاشرتی زندگی کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔
- اس ڈرامے میں کچھ توہمات کا ذکر کیا گیا ہے جس کا شکار عام انسان آج بھی ہے جیسے سفر میں جانے سے پہلے اگر چھینک آ جائے یا بلّی راستہ کاٹ جائے تو اسے بُرا شگون سمجھا جاتا ہے — لکھنوی تہذیب کا ایک حصّہ یہ بھی ہے کہ سفر پر جانے سے پہلے امام ضامن باندھتے ہیں جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپ کو خدا کی حفاظت میں دیا۔ اسی طرح سفر پر جانے سے پہلے دہی چکھنا بھی اچھّی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ صراحی یا کسی برتن کے ٹوٹ جانے کو بھی اچھّا سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی بلا ٹل گئی۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. میر صاحب سفر سے پہلے کیوں گھبرا رہے تھے؟
2. وہ اپنے ساتھ سفر میں کیا کیا سامان لے جا رہے تھے؟

3. میر صاحب نے اپنا سفر کیوں ملتوی کر دیا؟

4. میر صاحب کا کردار آپ کو کیسا لگا؟ مختصراً بیان کیجیے۔

عملی کام

- اپنے ساتھیوں کی مدد سے ڈرامے کے مکالموں کو ڈرامائی انداز میں پڑھیے۔
- جو کردار آپ کو پسند آیا ہو اس سے متعلق چند مکالمے خوشخط لکھیے۔
- نیچے لکھے ہوئے محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے:

سر کے بال سفید کرنا، کلیجہ ہاتھوں اُچھلنا، ہوا سے باتیں کرنا، ڈٹے رہنا، ہاتھ پیر پھولنا، الٹے پیروں واپس آنا، ہوا کے گھوڑے پر سوار ہونا، کھٹائی میں پڑنا

- نیچے لکھے ہوئے الفاظ کن موقعوں پر استعمال ہوتے ہیں:

الا اللہ، بسم اللہ، نصیبِ دشمناں

- اس ڈرامے میں کچھ تابع مہمل الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ تابع مہمل وہ بے معنی لفظ ہوتے ہیں جو بامعنی الفاظ کے ساتھ بطور تاکید یا ربط بولے جائیں۔ جیسے 'بانس کے ساتھ وانس' یہاں 'وانس' مہمل ہے آپ اس طرح کے کچھ الفاظ سوچ کر لکھیے۔